موج موج تشنگی
۱۱۳
عالمتاب تشنہ

عالمتاب تشنہ نے بھرپور شباب میں شاعری کا آغاز کیا تھا۔ میں محسوس کرتا ہوں
کہ یہ آغاز بہت مبارک ثابت ہوا کیونکہ آج تک اس کی شاعری پر اسی شباب کا پرتو ہے۔
میرے خیال میں اسی لیے تشنہ کی شاعری، جذبے کے حسن، اس کی شدت اور اس کی تہذیب
کی شاعری ہے۔ پھر اس نے جذبے کو محدود نہیں رکھا۔ کبھی یہ جذبہ کسی ایک ذات پر
مرکوز ہے تو کبھی کائنات اس کے حصار میں ہے۔ یہ ہمہ جہتی اور ہمہ گیری اسے روایت
کے ساتھ مثبت وابستگی نے بخشی ہے کہ وہ روایت کی نفی بھی نہیں کرتا اور عصر جدید
کے حوالے سے اس روایت میں ترمیم و اضافہ کو بھی کفر نہیں گردانتا۔ تشنہ اس لمحے
میں زندہ ہے، اس کا بھی اسے مکمل ادراک ہے، ماضی سے بھی دامن کش نہیں ہے اور مستقبل
میں جھانکنے کا بھی حوصلہ رکھتا ہے۔ یوں اسے اردو کی جدید غزل کے ایک حساس اور باشعور
نمائندے کی حیثیت حاصل ہے اور یہ حیثیت ہر لحاظ سے اہم ہے۔

احمد ندیم قاسمی

موج موج تشنگی

عالمتاب تشنہ

- تاریخ :- جنوری ۱۹۷۸ء
- تعداد :- ایک ہزار پانچ سو
- طابع :- سید آفتاب علی قاضی
- مطبع :- شارق پرنٹ ہاؤس، ناظم آباد ۲ کراچی
- ناشر :- ایوانِ ادب، ۸۰ سی محمد علی سوسائٹی، کراچی
- کتابت :- مظفر گجراتی
- باہتمام :- محسن بھوپالی

قیمت :- بارہ روپے

مہرو کے نام

آئینہ

مقدمہ

وہ ایک ابر آلود شام تھی رات کی سیاہی کوٹھوں سے اتر کر کمروں میں اندھیروں کو تہ بہ تہ بچھا رہی تھی۔ میں کراچی چھاؤنی کے ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک کوٹھی کے بالائی حصے میں بیٹھا ایک نرم خو میزبان کی گرم چائے سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ ایک صاحب تیز تیز قدموں سے جیسے انہیں دیر ہو گئی ہو کمرے میں داخل ہوتے میزبان نے تعارف کرایا اور بتایا کہ عالمتاب علی صاحب شاعر بھی ہیں اور تشنہ تخلص کرتے ہیں۔ دوران گفتگو یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کا تعلق میرٹھ سے ہے، میرٹھ یوپی کا ایک ایسا شہر ہے جس کی فضا میں شاعری رچی بسی ہوئی ہے، آج بھی اس شہر کی خوشبو میری روح کو معطر کر دیتی ہے۔ فرمائش پر تشنہ صاحب نے دو تین غزلیں سنائیں، سمندری ہوا کے جھونکوں، ابر آلود فضا اور میزبان کی خاطر و مدارات اور میرٹھ کی خوشبو کے ساتھ سارے شعر بہت اچھے معلوم ہوئے جب تشنہ نے یہ شعر پڑھا۔

مہینے بھر میں یہ مہتاب لوگو
بس اک دو دن ہی اُن جیسا لگے ہے

تو ساری فضا میں چاندنی سی بکھر گئی پہلی ہی ملاقات میں تشنہ دل میں اتر گئے۔

تشنہ صاحب ۱۹۵۲ء سے شعر کہہ رہے ہیں، ۱۹۵۸ء تک ایک شاعر کی حیثیت سے ان کی شہرت پھیل چکی تھی۔ کہ ۱۹۵۸ء میں ایک ایسا حادثہ پیش آیا کہ انھوں نے شاعری بھی ترک کر دی اور وطن بھی۔ بارہ سال کے طویل بن باس کے بعد، ۱۹۷۰ء میں پھر شاعری شروع کی اور بارہ سال کی یہ طویل خاموشی بھی ان کے شدتِ احساس اور قوتِ اظہار کو نہ دبا سکی، تشنہ صاحب کا یہ مجموعہ کلام پچیس سالہ شعری زندگی کا ایک ایسا خوبصورت گلدستہ ہے جسے میری طرح آپ

بھی پسند کریں گے۔ اس کلام میں آپ کو جذبہ احساس کی گرمی محسوس ہو گی زندگی کے تجربوں کی سچائی سلیقۂ اظہار کے ساتھ آپ کو متاثر کرے گی۔ اور آپ بھی یہ محسوس کریں گے کہ تشنہ کی شاعری ردیف و قافیہ کی آرائش کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ براہِ راست زندگی کی کش مکش سے وجود میں اتری ہے۔

یہ قلزم حیات تو پایاب تھا مگر ہر لمحہ میری فکر کو گہرائی دے گیا

اس کش مکش حیات سے ان کی شاعری کا خمیر اٹھا ہے اور جدید زندگی کے تضاد ابھر کر سامنے آیا ہے، اس مجموعۂ کلام میں جو کرب کا احساس ملتا ہے اس کا بنیادی سبب بھی یہی ہے ماضی کی یادیں جب حال کے شعور سے ہم آہنگ ہونا چاہتی ہیں۔ تو ایک ایسے کرب کو جنم دیتی ہیں۔ جو ذات سے نکل کر کائنات پر چھا جاتا ہے اور جسے حسن ذات اور حسن کائنات کی شاعری کا نام دیا جا سکتا ہے۔ کرب جو کھو کر پانے اور پا کر کھونے، یاد کر کے بھول جانے اور بھول کر یاد کرنے کے عمل سے پیدا ہوتا ہے اس کرب میں ہجر و وصال ایک ہو گئے ہیں۔

نہ فراق ہی کا غم ہے نہ وصال کی خوشی ہے
یہاں اپنا سر جھکا دے یہ مقام آگہی ہے

تشنہ کے لہجے کی نرمی اور تلخی بھی اسی کا نتیجہ ہے یہ چند شعر پڑھیے اور دیکھیے کہ تشنہ ہم سے کیا کہہ رہے ہیں۔ اور کس طرح کہہ رہے ہیں۔

ہم کو بنا دیا ہے زمانے نے خود پسند
کرتے ہیں اپنے آپ میں تجھ کو تلاش ہم
کاندھا نہ دے سکا ہمیں یہ شہر آشنا
تنہا اٹھائے پھرتے رہے اپنی لاش ہم
لہو لہان تھا میں اور سب تماشائی
کدھر سے آئے تھے پتھر کوئی نہ دیکھ سکا

کون دنیا میں شریکِ غمِ دل ہوتا ہے
اپنا غم اپنے ہی سینے میں چھپائے رکھنا

بلاؤ پھر سرِ مقتل مرے رقیبوں کو
حسابِ قرضِ رفیقاں چکا دیا جائے

شکستِ گوہرِ شبنم پہ رو رہا ہوں میں
تبسمِ گلِ خنداں تمہیں مبارک ہو

جس سے خورشید کی پلکوں پہ نمی آ جاتی
عارضِ گل پہ ہیں شبنم کا وہ قطرہ ہوتا

شکستِ دل کی خاموشی گراں کچھ اس قدر گذری
دکانِ شیشہ گر پہ سنگ برسانے کو جی چاہا

یہ اندوہِ فروغِ آگہی بھی اک قیامت ہے
ہزاروں بار اس جینے سے مرجانے کو جی چاہا

روشنی بھیج پیغمبروں کے خدا
ہم سے تیرہ شبوں کی سزا روشنی

ریگِ صحرا تھی دھوپ تھی ہم نے
ایک دنیا سراب کی ہم تھے

اس رستے پر بھٹکے ہم
جو رستہ دشوار نہ تھا

اس رستے پہ چل نکلے
جو رستہ ہموار نہ تھا

مسافتِ لب و عارض تمام ہو تو سہی
تجھے بھی اے روشِ ماہ و سال دیکھیں گے

زندگی کی کش مکش اور تضاد سے پیدا ہونے والا کرب اتنا سفاک ہوتا ہے کہ شاعر اور اس کی شخصیت کو پاش پاش کر دے لیکن تشنہ کے مزاج کے ٹھہراؤ نے تخلیقی سطح پر ایک ایسا سہارا پیدا کر دیا ہے کہ ان کا احساس پارہ پارہ نہیں ہوتا بلکہ وحدت بن کر اور

گہرا ہو جاتا ہے اسی وجہ سے ان کی غزلوں میں مسلسل غزل کی فضا کا اثر در آیا ہے یہ رنگ دائر
وہاں اور نکھرتا ہے جہاں وہ ناصر کاظمی کے انداز میں شاعری کرتے ہیں اور اس جیسی شاعری کرتے
ہوئے بھی اس سے الگ رہتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ تشنہ اپنی شاعری کا آغاز وہاں سے
کر رہے ہیں جہاں سے ناصر کاظمی نے اسے چھوڑا تھا اور یہی بات جدید اردو شاعری میں ان کا
ایک منفرد مقام متعین کر دیتی ہے۔ آج کی غزل جس انتشار کا شکار ہے اور اس بدلتے ہوئے
معاشرے میں جس لب و لہجہ آہنگ کا متلاشی ہے اس میں بکھر جانے کا پتہ تو چلتا ہے لیکن روایت
کے بننے اور سمٹنے کا احساس نہیں ہوتا۔ تشنہ کے یہاں بکھرنے کا نہیں بلکہ سمٹ کر ایک اکائی
بن جانے کا احساس ہوتا ہے وہ ایک طرف روایت سے وابستہ نظر آتے ہیں اور دوسری طرف
اسے اپنے جدید شعور میں ڈھالنے کی قوت بھی رکھتے ہیں۔ یہ چند شعر پڑھیے اور دیکھیے ان میں روایت
اور جدت مل کر کس طرح ایک ہو گئے ہیں۔

گرمی سی ترے جسم کی محسوس ہوئی ہے
گھبرا کے کئی بار مری آنکھ کھلی ہے

کچھ رخت سفر بھی ساتھ لے لو
رستے میں ہی رات ہو گئی تو

قلم کیا مرے ہاتھوں کو شب پرستوں نے
میں لکھ رہا تھا چراغوں کی داستاں لوگو

وہ تیرگی ہے کہ بجھنے لگی ہے بینائی
چراغِ اوّل شب ہے دھواں دھواں لوگو

پیار کی پہلی بارش میں
دیر تلک ہم بھیگے تھے

جسم کا جنگل پیاسا تھا
روح پہ بادل برسے تھے

دور افق میں قتل ہوا ہے سورج کا
لاش اٹھانے چاند ستارے آتے ہیں

تشنہ نے نظمیں بھی لکھی ہیں اور دوہے بھی۔ اور بہت سے متفرق اشعار بھی مجموعہ میں شامل کئے ہیں۔ لیکن یہ سب ایک ہی ذات اور مزاج کے مختلف روپ ہیں۔ ان کی شاعری پڑھ کر امید بندھتی ہے کہ جدید اردو شاعری جلد ہی اپنا نیا آہنگ و احساس تلاش کر لے گی۔ "موج موج تشنگی" ایک ایسا مجموعۂ کلام ہے جسے شاعری کے رسیا یقیناً پسند کریں گے اور جسے اردو ادب میں ایک ممتاز مقام ملے گا لیکن میں ان کے دوسرے مجموعے کا انتظار کروں گا "دیکھیں کیا گذرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک"۔

جمیل جالبی

۱۶ اکتوبر ۱۹۷۷ء

کیوں دی مجھے ولایتِ ادراک و آگہی
اب کائنات سترِ مشیت نہیں رہی

-۱۰

دے مری گمرہی کا صلہ روشنی
روشنی روشنی اے خدا روشنی

روشنی بھیج پیغمبروں کے خدا
ہم سے تیرہ شبوں کی سزا روشنی

تجھ سے مل کر یہ محسوس ہونے لگا
روشنی سے ہوئی آشنا روشنی

رات اور بے نشاں منزلوں کا سفر
اے مری لغزشِ پا دکھا روشنی

آتشِ گل کھلی ہے چمن در چمن
موسمِ گل ہے دل میں کھلا روشنی

نورِ صبحِ ازل تجھ سے مانگوں تو کیا
ہو مرے فکر و فن کو عطا روشنی

رات قسمت سے تشنہ نے وہ پی کے بس
جام مہتاب تھا میکدہ روشنی

قریہ بہ قریہ کو بہ کو ہم نے تلاش کر لیا
کارگہِ حیات میں کھو گیا آدمی کہاں
تیرہ شبیٔ عصرِ نو گل ہیں چراغ آگہی
شہرِ سیاہ روز میں حجلۂ روشنی کہاں

×

جہانِ ہست میں گم ہو گیا ہوں لا کی طرح
مرے وجود کا عالم ہے ماورا کی طرح

کیا گیا ہے مجھے لوحِ کائنات پہ نقش
میں لفظ لفظ میں ہوں حرفِ بے نوا کی طرح

ملے مجھے بھی تو آخر سماعتوں کی لحد
میں دوشِ وقت پہ ہوں لاشۂ صدا کی طرح

مری فضاؤں میں قدموں کی چاپ ہی گونجے
سکوتِ ذات ہے پھیلا ہوا خلا کی طرح

کسی کی آہ سے پگھلا نہ اشک ہی سے بہا
میں عرشِ ذات پہ بیٹھا رہا خُدا کی طرح

نہ دورِ جام مرے نام ہے نہ عارض و لب
میں بزمِ زیست میں ہوں دستِ نارسا کی طرح

مجھی سے تم کو ملے گا سراغِ منزلِ شوق
ہوا ہوں ثبت میں راہوں پہ نقشِ پا کی طرح

مرے لئے بھی درِ مستجاب کھل جائے
قبولِ وِرد میں ہوں اندیشۂ دعا کی طرح

تمام جبر ہے تشنہؔ یہ قیدِ رسمِ وجود
گذر رہے ہیں شب و روز اک سزا کی طرح

تھے کبھی قافلۂ سرو سمن میں ہم بھی
رقص کرتے ہوئے آئے تھے چمن میں ہم بھی

یہ الگ بات کسی پیڑ سے منسوب نہیں
برگِ آوارہ سہی ہیں تو چمن میں ہم بھی

ہیں فصیلوں پہ ہمارے بھی لہو کے چھینٹے
تھے کبھی کشمکشِ دار و رسن میں ہم بھی

حکمِ آزادیٔ گفتار ہمیں بھی دیجے
اک زباں رکھتے ہیں زندانِ دہن میں ہم بھی

شہرِ ناقدر شناساں میں ہوئے ہیں بے مول
لعلِ نایاب تھے بازارِ یمن میں ہم بھی

ہم نے بھی تیرے خد و خال کے قصے لکھے
معتبر ہو گئے اقلیمِ سخن میں ہم بھی

رات بھر لکھتے رہے قوسِ قزح کا مضموں
رنگ بھرتے رہے تصویرِ بدن میں ہم بھی

ہم کو بھی عشق کا دعویٰ ہے گلوں سے تشنہ
چُن دیئے جائیں گے دیوارِ چمن میں ہم بھی

نشاطِ گرمیٔ بزمِ خیال دیکھیں گے
دیئے بجھا کے ترے خد و خال دیکھیں گے

مسافتِ لب و عارض تمام ہو تو سہی
تجھے بھی اے رُشِ ماہ و سال دیکھیں گے

۷-

اب ایسی بزم میں کیسے کھلے زباں لوگو
نظر کو اذنِ نظارہ نہیں جہاں لوگو

قلم کیا مرے ہاتھوں کو شب پرستوں نے
میں لکھ رہا تھا چراغوں کی داستاں لوگو

وہ تیرگی ہے کہ بجھنے لگی ہے بینائی
چراغِ اول شب ہے دھواں دھواں لوگو

میں بات کرتا رہا خوشبوؤں کے لہجے میں
کوئی سمجھ نہ سکا پیار کی زباں لوگو

جلوسِ تیرگیٔ شب ادھر سے گذرے گا
سجادؔ اپنے دریچوں میں کہکشاں لوگو

تمام شہر میں جب گفتگو کا موسم ہے
حصار جبر میں ہے کیوں مری زباں لوگو

-۶

ہر تماشے میں ترا حسن تماشا دیکھوں
چاند دیکھوں کہ ترا چاند سا چہرہ دیکھوں

شاق گذرے ترا ہنگامۂ محفل مجھ پر
میں بھری بزم میں اک دن تجھے تنہا دیکھوں

بے مثالی بھی تری اب تو گراں ہے دل پر
دیکھ کر تجھ کو یہ خواہش ہے کہ تجھ سا دیکھوں

ہاں کوئی موجِ نفس، کوئی ہوا کا جھونکا
کیوں سرِ قریۂ جاں شمع کو جلتا دیکھوں

دیکھ کر تجھ کو یہ محسوس کیا ہے میں نے
خواب میں جیسے میں خوشبو کا ہیولا دیکھوں

ایک کہانی

اک کہانی سنو
وہ جو اوراقِ تاریخ پر ثبت ہے وہ کہانی سنو
اک کہانی سُنو
ایک تھا بادشاہ (ہے ہمارا تمہارا خدا بادشاہ)
روم میں جس کے جبروت کا غلغلہ
شہر در شہر تھا
جس کی ہیبت سے لرزاں تھے کوہ و دمن
رُوبرو جس کے سجدے میں تھا اہرمن
اس نے سوچا کہ جشنِ چراغاں منے
اک نئی طرز کا اک نئی شان سے
اور پھر اس نے جشنِ چراغاں کیا
شہرِ خستہ تناں نذرِ آتش ہوا
شہر کا چپہ چپہ سلگنے لگا
شہر جلنے لگا
بادشہ اپنے اونچے محل کے دریچے میں بیٹھا ہوا
محوِ نظارۂ جشنِ آتش رہا

ساز بجتے رہے
قہقہے آدمیت کی چیخیں دباتے رہے
تیز ہوتی گئی اور آوازِ نَے
شہر جلتا رہا

اور پھر اس طرح
شہر جلنے کی اک رسم سی پڑ گئی
ہیروشیما جلا ناگاساکی جلا
ارضِ مقدس کے محراب و منبر جلے
اور سیگاؤں پر کتنے نیپام بم
آگ کا رزق تقسیم کرتے رہے
شہر بیروت میں آگ بوئی گئی
نذرِ آتش ہوئے جانے کتنے نگر
شہر جلتے رہے
آگ کا کھیل اوراقِ تاریخ میں
جابجا درج ہے
آگ کا کھیل ہے آج بھی ایک معصوم سا مشغلہ
اے مری نسل تو آگ کے کھیل کا جشنِ آخر منا
کل کی معصوم نسلوں کے شہروں کو تو
آگ کی شعلہ سامانیوں سے بچا

☆

ہو گئی پھول سے جدا خوشبو
چند لمحوں کی تھی ہوا خوشبو

رات کو خواب کے جھروکوں سے
جھانکتی ہے اک آشنا خوشبو

چھیڑ پھر کوئی دلنشیں نغمہ
اپنی آواز کی سنا خوشبو

ٹوٹتا جا رہا ہے نشۂ شب
اپنے انفاس کی پلا خوشبو

زلف کے ساتھ کھل رہی ہے قبا
اب منائے گی رتجگا خوشبو

میرے نزدیک سے گذرتے ہوئے
کہہ گئی اپنا مدعا خوشبو

پھول کی ہو سکی نہ عمر دراز
مانگتی رہ گئی دعا خوشبو

مدھ بھرے نین سے کوئی تشنہ
آج مجھ کو پلا گیا خوشبو

اب اس قسم کے سوا اور کیا قسم کھاؤں
تجھے نہ پاؤں اگر تجھ سے کوئی پیارا ہو

میں اس نظر کو چھپاتا پھروں زمانے سے
وہ جس نظر سے ترا پیار آشکارا ہو

میری ہر ایک بات سنو گیان دھیان سے
اترے گی اب نہ کوئی کتاب آسمان سے

پہنا ہے جب سے میں نے یہ شیشے کا پیرہن
ڈرنے لگا ہوں راہ کی ہر اک چٹان سے

دشت حیات میں وہ کڑی دھوپ تھی کہ بس
چُنتا رہا میں پیاس کے کانٹے زبان سے

کم ظرف ہیں یہ گہرے سمندر کی وسعتیں
بدلا ہے کب ہواؤں کا رُخ بادبان سے

تشکیک سے ملا ہے مجھے درس آگہی
مجھ کو یقینِ ذات ہوا ہے گمان سے

سونے کا تھال سر پہ اٹھاتے ہوئے تھی شام
کندن لٹا رہا تھا کوئی آسمان سے

تاریکیوں پہ ضرب لگاتے ہوئے چلو
نکلے گا ایک چاند بھی راتوں کی کان سے

انصاف تولتے رہو میزانِ عدل پر
جانا تھا جس کو وہ تو گیا اپنی جان سے

کیا کیا نہ تیر آئے ہیں یاروں کے اس طرف
ڈرنے لگا ہوں اپنی غزل کی اٹھان سے

تشنہ بسائیے دلِ خانہ خراب کو
ویرانیاں بھی ڈرتی ہیں خالی مکان سے

۷

کوئی صاحب نظر نہیں دیدہ ور نہیں
یہ شہرِ فن بھی اب ارضِ ہنر نہیں

کہاں میں گم ہوا ہوں کچھ خبر نہیں
غبارِ آگہی تک ہم سفر نہیں

مری وارفتگی پہ ہنسنے والو
میں کچھ اتنا بھی خود سے بے خبر نہیں

سکوں کے واسطے گھر چاہتا ہوں
سکونت کے لئے دیوار و در نہیں

لگا ہے دل کو دھڑکا رہزنی کا
کہاں لٹ جائے رختِ جاں خبر نہیں

میں ہوں اُس دشت کا تنہا مسافر
جہاں سورج تو ہے لیکن شجر نہیں

ہے اب بھی دوست سارا شہر تشنہ
کہیں وہ مہرباں صورت مگر نہیں

وہی لکھتا رہا ہوں زندگی بھر
جو دل میں روشنی محسوس کی ہے
کبھی تم نے بھی میرا ذکر سن کر
عجب سی اک خوشی محسوس کی ہے

٭

جنگل سے چرواہے لوٹ کے آتے ہیں
شام ہوئی تو ہم بھی گھر کو جاتے ہیں

بجتے ہیں آوارہ پتوں کے گھنگرو
سرد ہوا کے جھونکے دھیان بٹاتے ہیں

دور اُفق میں قتل ہوا ہے سورج کا
لاش اُٹھانے چاند ستارے آتے ہیں

نیند کی منزل کوسوں دور ہے آنکھوں سے
راہوں میں سب خواب بکھرتے جاتے ہیں

بھیگ چلی ہے رات یہاں کون آئے گا
ہر آہٹ پر کیوں ہم چونک سے جاتے ہیں

شام سے ہی دل کو دھڑکا لگ جاتا ہے
خوابوں کے اندیشے نیند اُڑاتے ہیں

سوچ کے تنہائی میں تشنہ ہنستا ہوں
کیسے کیسے لوگ مجھے سمجھاتے ہیں

میزانِ آرزو میں تجھے تولنے لگے
نظروں سے تیرا بندِ قبا کھولنے لگے
آزاد ہے وہی جو اسیری کے باوجود
اُڑنے کا نام آئے تو پَر تولنے لگے

۱۰

تو میری فکر کو احساس کی خدائی دے
غمِ کمال نہ دے رنجِ نارسائی دے

ہر ایک لفظ کے پیکر میں ہو تری خوشبو
مری غزل میں ترا ہر نفس سنائی دے

لکھوں جو حرف مہ و آفتاب بن جائیں
صریرِ خامہ کو اتنی تو روشنائی دے

میں تیرے وصف میں حرفِ تمام لکھ جاؤں
تو اپنے لوح و قلم تک مجھے رسائی دے

میں تجھ کو چاہوں تو ایسا کہ خود فنا ہو جاؤں
مرا وجود ترا آئینہ دکھائی دے

جو پھول بن کے مہکتا رہے خیالوں میں
وہ کربِ عشق دے وہ زخمِ آشنائی دے

میں روشنی ہوں اندھیروں سے دُور رکھ مجھ کو
طلوعِ مہرِ درخشاں کی خوش ادائی دے

ہر ایک ناوکِ دشنام پہ دعائیں دوں
مرے خدا مجھے اوصافِ مصطفائیؐ دے

یاد آتے ہیں بہت یارانِ شب ہائے شباب
آجکل محسوس ہوتا ہے اکیلا پن بہت
جوگ ہم نے بھی لیا باہمی کے باسی ہم بھی ہیں
ہم سے بھی مانوس ہے تنہائی کی ناگن بہت

٭

رہ کر ہیں سمندر میں سمندر سے جُدا ہوں
قطرہ ہوں مگر ظرف میں دریا سے بڑا ہوں

ہیں ارض و سما میرے ہی بکھرے ہوئے ٹکڑے
آئینہ ہوں اور دشتِ مشیت سے گرا ہوں

پتھر سے ڈراؤ نہ مجھے سنگ نژادو
شیشے کا بدن لے کے چٹانوں پہ کھڑا ہوں

اکثر یہ ہوا ہے کہ خیالوں کے افق میں
میں شام کے سورج کی طرح ڈوب گیا ہوں

کھل جاؤں گا اک عقدۂ آساں کی طرح میں
اے پیرہنِ زیست ترا بندِ قبا ہوں

دم لینے کی مہلت مجھے اے بادِ سفر دے
پتّہ ہوں ابھی شاخ کی باہوں سے گرا ہوں

زندہ ہوں کہ جینے کا مجھے حکم ملا ہے
ناکردہ گناہوں کی سزا کاٹ رہا ہوں

آیا نہ میسّر جنہیں پیراہنِ تحریر
ان لفظوں کی حسرت ہوں تمنا ہوں دعا ہوں

تشنہ مری منزل کا پتہ ہے نہ ٹھکانہ
میں موجۂ دریا ہوں کہ صحرا کی ہوا ہوں

یہ کربِ انبساط یہ جشنِ نشاطِ غم
ہنگامہ ہائے شب ہمہ شب دیکھتے چلو

غزل

چلا تھا میں تو شریکِ سفر نہ تھا کوئی
لہولہان سرِ رہ گذر نہ تھا کوئی

کسی اسیر میں دیکھی نہ جرأتِ پرواز
کھلی فضائیں تھیں بے بال و پر نہ تھا کوئی

ملا نہ شہرِ ہنر میں بھی کوئی اہلِ ہنر
تھی میرے ہاتھ میں دستار سر نہ تھا کوئی

نشانِ جادۂ منزل کی جستجو تھی مجھے
تھے راہ بر تو سبھی ہم سفر نہ تھا کوئی

وہ زندگی تھی خدایا کہ دشتِ بے سایہ
غموں کی دھوپ کڑی تھی شجر نہ تھا کوئی

اُس انجمن میں سبھی سرفروش تھے تاہم
پڑا جو وقت تو پھر دار پر نہ تھا کوئی

٭

میں شوقِ رنگ رنگ ہوں خیال کی امنگ ہوں
میں صبح کا پیام ہوں میں شام کی ترنگ ہوں

سپاہِ خیر و شر ہیں صف بہ صف مرے وجود میں
میں رزم گاہِ زندگی میں کربلا کی جنگ ہوں

برہنگی بھی چھپ گئی نقوش بھی ابھر گئے
میں زندگی کے جسم کی عجب قبائے تنگ ہوں

بساطِ روز و شب پہ لگ رہی ہیں روز بازیاں
میں جیت کے بھی خوش نہیں میں ہار کے بھی دنگ ہوں

نہ چھپ سکے گی قامتِ خیال کی برہنگی
بہ زحمتِ لباس کیوں میں زندگی کا ننگ ہوں

ہیں رشتۂ انا کی بیڑیاں ہمارے پاؤں میں
چراغِ شعلہ سر ہے تُو میں پر جلا پتنگ ہوں

دل و نظر شرر فشاں ہوئے ہر ایک چوٹ پر
تو ضربِ تیشۂ ستم ہے میں فغانِ سنگ ہوں

کہیں تو چھاؤں زلف کی کہیں تو سیج نرم سی
میں نیند کا ہوں رتجگا میں خوابِ شوخ رنگ ہوں

کمال دلنوازیاں کمال دوست داریاں
کبھی وہ پھول پھول ہے کبھی میں سنگ سنگ ہوں

نفس نفس مری مہک نظر نظر مری طلب
دہک اٹھے جو عارضوں پہ دل کی وہ امنگ ہوں

۷

عرصۂ ہستی سے ہم ناکامیاں چُنتے رہے
روشنی ہوتے رہے تاریکیاں چُنتے رہے

لوگ موتی لائے گہرے پانیوں کی گود سے
اور ہم ساحل پہ بیٹھے سیپیاں چُنتے رہے

زندگی بھر مصلحت بینی رہا اپنا مزاج
عمر بھر اندیشۂ سود و زیاں چُنتے رہے

اپنے عکسِ ذات کو کرتے رہے شیرازہ بند
آئینہ خانوں سے ہم پرچھائیاں چُنتے رہے

سر پھرے دریاؤں کی موجوں پہ ڈالا ہم نے ہاتھ
قلزمِ ہستی سے ہم طغیانیاں چُنتے رہے

ہم تھے اور تنہائی کا دریائے ناپیدا کنار
تیری یادوں کے بھنور سے ہچکیاں چُنتے رہے

کر دیا اہلِ ہوس نے دامنِ گل تار تار
اور ہم ملبوسِ گل کی دھجیاں چُنتے رہے

مجھے یہ دولتِ غم شوق سے عطا کر دے
مگر بہ شرط اسے درد آشنا کر دے

۱

ریگِ صحرا بھی دھوپ بھی ہم تھے
ایک دنیا سراب کی ہم تھے

جو کھنچی تھی افق کے ماتھے پر
وہ سنہری لکیر بھی ہم تھے

چاکِ دامانِ شب کیا جس نے
سرپھری سی وہ روشنی ہم تھے

اک تماشہ تھے ہم سرِ بازار
بزمِ خوباں کی دلکشی ہم تھے

جو ہواؤں کے طاق میں بھی جلے
ان چراغوں کی روشنی ہم تھے

چاکِ پیراہنِ حیات تھے ہم
اپنا رقصِ برہنگی ہم تھے

تھا بہاروں میں رنگ و بو ہم سے
شہرِ گل کی بہار بھی ہم تھے

موجۂ زندگی کا شور تھے ہم
دشتِ ہستی کی خامشی ہم تھے

تھا ہمیں سے وہ جشنِ بزمِ حیات
قریۂ جاں کی روشنی ہم تھے

تشنہ اس دورِ مے پرستی میں
اپنا پندارِ تشنگی ہم تھے

۱۷

تو قلزم تھا میں دریا تھا
مجھ کو تجھ سے ہی ملنا تھا

میں نے تیرا چاند سا مکھڑا
اپنی نظروں سے چوما تھا

اس انبوہِ سرو قداں میں
تو ہی تو سب سے اونچا تھا

میرے پیار کا پہلا جھُمکا
تیرے عارض پر چمکا تھا

تو نے نظریں نیچی کر کے
پیار کا جب اقرار کیا تھا

تیری پلکیں بھیگ چلی تھیں
تیرا آنچل ڈھلک گیا تھا

تو میری باہوں میں آ کر
پھول کی صورت کھل اٹھا تھا

میری پلکوں کے گوشوں پر
تیرے عارض کا غازہ تھا

تیرے جسم کی ہر ٹہنی میں
میرے سانسوں کا جھونکا تھا

تیری زلفوں کے پیچوں میں
میری پلکوں کا شانہ تھا

تیرے لبوں کی بنیادوں پر
میرے ہونٹوں کا ملبہ تھا

سرخ ہوئیں تھیں تیری آنکھیں
دیر تلک میں بھی جاگا تھا

برسوں تیرے جسم کا چندن
میرے پہلو میں سلگا تھا

میں نے اپنے پیار کا سورج
تیرے ماتھے پر ٹانکا تھا

اپنی دعائے نیم شبی میں
میں نے تجھ کو ہی مانگا تھا

جان و دل سے ٹوٹ کے میں نے
ایک تجھی کو تو چاہا تھا

تیرے سانسوں کی خوشبو سے
میرا تن من مہک اٹھا تھا

تشنہ نے تیری چاہت کا
شیش محل تعمیر کیا تھا

☆

شہر میں قتلِ عام ہوا تھا
میں بھی شہیدِ دستِ جفا تھا

اے برسات بنانے والے
میں بھی برسوں کا پیاسا تھا

باغ میں پھول کھلانے والے
میں نے بھی ہنسنا چاہا تھا

سیپ کو موتی بخشنے والے
میں بھی بارش کا قطرہ تھا

اے میٹھی نیندوں کے خالق
دیر تلک میں کیوں جاگا تھا

سچے خواب دکھانے والے
میرا سپنا کیوں جھوٹا تھا

میرے جذبوں کے صحرا میں
دھوپ نے کیوں ڈیرا ڈالا تھا

میری دنیا سے آخر کیوں
سورج نے منہ پھیر لیا تھا

میری رات کے نیل گگن کا
چاند بھی رستہ بھول گیا تھا

سب کو خوشیاں بانٹنے والے
مجھ کو ہی کیوں غم بخشا تھا

دنیا کا دل رکھنے والے
تشنہ سے کیوں روٹھ گیا تھا

۲۷

جب تو مجھ سے بچھڑ رہا تھا
پھوٹ پھوٹ کے دل رویا تھا

تیری پلکوں پہ شبنم تھی
میری آنکھوں میں دریا تھا

تیری زلفوں میں افشاں تھی
میری راہ میں اندھیارا تھا

دل پہ قیامت ٹوٹ رہی تھی
صبر کا دامن چھوٹ گیا تھا

پیار سے میرا ہاتھ دبا کر
تو نے سینے پر رکھا تھا

جلتے ہونٹوں سے پھر تو نے
میرے ہاتھ کو چوم لیا تھا

میرے ہاتھ کی پشت پہ سجنی
تیرے ہونٹوں کا نقشہ تھا

پھر میں تجھ سے رخصت ہو کر
جیون رستوں میں تنہا تھا
انجانی سی ہر منزل تھی
سُونا سُونا ہر رستہ تھا

آج وہ سب کچھ یوں لگتا ہے
جیسے اک سپنا دیکھا تھا

قرب بھی سپنا پیار بھی سپنا
سپنا بھی کیسا جھوٹا تھا

تیرے جسم کے ساحل پر بھی
تشنہ قرنوں کا پیاسا تھا

☆

ساحل پر کہرام مچا تھا
دریا رستہ بدل رہا تھا

وقت کے ہاتھوں سے پچھم میں
سونے کا اک تھال گرا تھا

یہ کس کو آغوش میں لے کر
شام کا چہرہ دمک رہا تھا

پھولوں کے نازک سینے میں
کرنوں کا نیزہ اترا تھا

شبنم کے جگمگ شیشے پر
سورج نے پتھر مارا تھا

اے دل اس کی اتنی چاہت
تو نے اس میں کیا دیکھا تھا

وہ کیسا احساس تھا یا رب
جیسے کچھ ہونے والا تھا

تیز بہت تھی درد کی آندھی
پتہ پتہ لرز رہا تھا

دل کی طنابیں ٹوٹ رہی تھیں
خیمۂ جاں گرنے والا تھا

دل کے شیش محل میں تشنہ
کون یہ پتھر پھینک رہا تھا

جس رات گلابوں سے تری سیج سجی تھی
اس رات درختوں پہ بہت اوس پڑی تھی

٭

کوئی دیوار تھی نہ سایا تھا
زندگی تھی کہ ایک صحرا تھا

وہ ملا دشتِ خواب میں اکثر
اپنے شعروں میں جس کو لکھا تھا

جانِ بزمِ حیات تیرے بغیر
میں ہر اک انجمن میں تنہا تھا

پھر مجھے موت بھی نہیں آئی
کیوں تجھے زندگی بنایا تھا

آئینے سے بھلا کہاں نسبت
دل بڑی خامشی سے ٹوٹا تھا

میں تھا پت جھڑ کا برگِ آوارہ
تو خزاں کی ہوا کا جھونکا تھا

میرے شانوں سے تو نے آخرِ شب
اپنی زلفوں کو جب سمیٹا تھا

اک قیامت سی دل میں جاگی تھی
ایک محشر سا مجھ پہ گزرا تھا

چاند میں بھی تری شباہت تھی
پھول تیری مہک سے مہکا تھا

اب سرِ بزم ہے وہ حشر بدوش
وہ جو تنہائیوں میں کھلتا تھا

مجھ کو دیجے سزائے جرمِ صدا
میں نے قفلِ سکوت توڑا تھا

میں نے ہی تیرگی کے خیموں پر
روشنیوں کا تیر پھینکا تھا

تلاش

میں کھو گیا ہوں
حیات کی تنگ و تار گلیوں میں کھو گیا ہوں
میں زندگی کے اجاڑ ویران راستوں پر
نہ جانے کب سے بھٹک رہا ہوں
میں اپنی گمراہیوں پہ خوش تھا
وجود کے دائرے میں سمٹا تو میں نے سوچا
کہ میں نے منزل کو پا لیا ہے
مگر یہ میرا فریب ہی تھا
کہ میرا اپنا وجود اپنے ہی دائروں کے حصار میں قید
کھلی فضا کی تلاش میں تھا

میں وقت کے در پہ دستکیں دے کے تھک چکا ہوں
حیات کی تنگ و تار گلیوں میں کھو گیا ہوں
کوئی تو مجھ کو تلاش کر لے

سائرن

خبیث آواز سائرن کی
فضا میں گونجی
بموں کی چیخیں
گھناؤنی روشنی کے لپکے
شفیق تاریکیوں پہ نفرت کے تازیانے
گھٹے ہوئے دم رُکی ہوئی سانس بستیوں کی
فسونِ دہشت سے شہر کا شہر بُت بنا تھا

شفیق آواز سائرن کی
فضا میں گونجی
گھٹے ہوئے دم رُکی ہوئی سانس کلبلائی
چراغ جاگے تو میں نے دیکھا
ہزاروں انسان سو چکے تھے
گلاب سے نرم نرم عارض جھلس چکے تھے
ہزاروں مانگیں اجڑ چکی تھیں
سہاگنیں اپنی گرم بانہوں میں سرد لاشیں سمیٹ کر

خون رو رہی تھیں
ہمکتے بچے شہید ماؤں کے خشک سینوں سے
منہ لگائے
حیات کا رزق لے رہے تھے

جہاں فلک بوس بلڈنگیں تھیں
وہاں کھنڈر مسکرا رہے تھے
جنون و وحشت کا دیوتا اپنی کامرانی پہ رقص کرتا
زمیں کو دوزخ بنا رہا تھا

شفیق آواز سائرن کی
فضا میں تحلیل ہو رہی تھی

۱۶

متاعِ جاں سرِ بازار لٹوانے کو جی چاہا
اُسی بے مہر کے کوچے میں بِک جانے کو جی چاہا

شکستِ دل کی خاموشی گراں کچھ اس قدر گذری
دکانِ شیشہ گر پہ سنگ برسانے کو جی چاہا

کہیں کا بھی نہ رکھا تندیٔ احساس نے مجھ کو
مرا ہر پھول کے ہمراہ مرجھانے کو جی چاہا

یہ اندوہِ فروغِ آگہی بھی اک قیامت ہے
ہزاروں بار اس جینے سے مرجانے کو جی چاہا

ہجومِ یاس نے جب اشک بھی چھوڑے نہ آنکھوں میں
لبِ گل پہ ہنسی بن کر بکھر جانے کو جی چاہا

فضائیں چپ ہراساں شہر گلیاں دم بخود تشنہ
مرا سنگِ صدا ایسے میں برسانے کو جی چاہا

☆

تجھ کو اپنا سمجھا تھا
میں کیسا دیوانہ تھا

میں تھا ریت کناروں کی
تو اک چڑھتا دریا تھا

صحراؤں کی پیاس تھا میں
تو ساون کی برکھا تھا

دشتِ بلا کی دھوپ تھا میں
تو نظروں کا دھوکا تھا

میں تھا برگِ آوارہ
تو پُروا کا جھونکا تھا

تجھ کو خواب میں دیکھ کے میں
گہری نیند سے چونکا تھا

☆

میں نے تجھ کو یوں دیکھا
جیسے تو اک سپنا تھا

میں نے اپنی غزلوں میں
تیرا روپ سجایا تھا

رحلِ محبّت پر رکھ کر
پہروں تجھ کو پڑھتا تھا

لفظوں کے پیراہن سے
میں نے تجھ کو ڈھانپا تھا

میری فکر کی مسند پر
اک تُو ہی تو بیٹھا تھا

میں خود سے بھی روٹھ گیا
تجھے منانے آیا تھا

دنیا چھاؤں میں بیٹھی تھی
میں نے پیڑ لگایا تھا

میرے جسم کے صحرا پر
تیرے پیار کا سایا تھا

تری زلف کی چھاؤں میں
تشنہ چین سے سویا تھا

آپ ہی دے دیں غمِ ہستی غمِ جاناں کے ساتھ
ہر کسی کے سامنے کیوں ہاتھ پھیلاتے پھریں

☆

ہم کو بنا دیا ہے زمانے نے خود پسند
کرتے ہیں اپنے آپ میں تجھ کو تلاش ہم

کاندھا نہ دے سکا ہمیں یہ شہرِ آشنا
تنہا اٹھائے پھرتے رہے اپنی لاش ہم

لے جائے دیکھیے کہاں یہ صرصرِ حیات
کس دشت میں نہ جانے رکھیں بود و باش ہم

شیشے کا جسم اوڑھ کے نکلے تھے شہر میں
اب کیا گلا کریں کہ ہوئے پاش پاش ہم

ہے کاروبارِ زیست میں ہم سے ہماہمی
اے دوست نبضِ وقت کا ہیں ارتعاش ہم

جو ہو سکی نہ وقت کے مرہم سے مندمل
ہیں چہرۂ حیات کی ایسی خراش ہم

تشنہ ہمارے نام پہ لگتی ہیں بازیاں
دستِ قمار باز میں ہیں گویا تاش ہم

ہے رشتۂ خلوص مجھے جان سے عزیز
یہ زندگی رہے نہ رہے دوستی رہے
ان عارضوں کے پھول مہکتے رہیں سدا
شیشے میں ان لبوں کی حرارت گھلی رہے

٭

قامت سے اپنے کوئی تو اونچا دکھائی دے
ہم دیکھتے رہے کوئی ہم سا دکھائی دے

سورج کے ڈوبنے پہ یہ نقشہ دکھائی دے
پیڑوں سے بڑھ کے پیڑ کا سایا دکھائی دے

پتھر یہ کس نے پھینکا ہے یادوں کی جھیل میں
دھندلا سا ایک عکس لرزتا دکھائی دے

دھارا ہے خواہشوں نے فریبِ نظر کا روپ
ریگِ رواں بھی پیاس میں دریا دکھائی دے

دیکھی ہے ہم نے وسعتِ صحرائے زندگی
ذرہ بھی اپنے آپ میں دنیا دکھائی دے

ماہِ تمام میں ہو ترا پرتوِ جمال
اک روز تو یہ چاند بھی تجھ سا دکھائی دے

تشنہ ہمیں یہ کس نے خود آرا بنا دیا
ہر آئینے میں اپنا ہی جلوہ دکھائی دے

رات کو سطحِ آب پر دیکھا ہے بارہا مگر
چاند کبھی کبھی لگا تیری مثال کی طرح

پھر وہی رتجگوں کی رت پھر وہی خواہشوں کا رقص
تیرا فراق بھی ملا تیرے وصال کی طرح

☆

چومے ہے نظر وہ لب و رخسار ابھی تک
آنکھوں میں ہے اک لمحۂ دیدار ابھی تک

چمکی تھی کبھی برق نظر خیمۂ جاں پر
لرزاں ہے مگر روح کی دیوار ابھی تک

بجتی ہیں مرے کان میں اب تک تری سانسیں
سنتا ہوں ترے قرب کی جھنکار ابھی تک

پھولوں سے کبھی ایک تعلق تھا ہمارا
دامن سے الجھتا ہے سرِ خار ابھی تک

خونِ گل و لالہ سے جو گل رنگ ہوئی تھی
ہے دستِ صبا میں وہی تلوار ابھی تک

اوجھل ہے نگاہوں سے وہ اک سازِ مجسّم
اک موجِ صدا ہے پسِ دیوار ابھی تک

سورج تو سوا نیزہ پہ آ پہنچا ہے تشنہ
دیکھے نہ مگر صبح کے آثار ابھی تک

نہ فراق ہی کا غم ہے نہ وصال کی خوشی ہے
یہاں اپنا سر جھکا دے یہ مقامِ آگہی ہے

۲

تابشِ خونِ شہیدانِ وفا رہنے دو
میرے زخموں پہ کفِ دستِ حنا رہنے دو

زلف سے شعلۂ عارض کو ڈھکا رہنے دو
اس دہکتے ہوئے سورج پہ گھٹا رہنے دو

بجھ گئی شمعِ حرم گُل ہیں کلیسا کے چراغ
درِ میخانہ تو اس وقت کُھلا رہنے دو

نہ تمہیں عشق سے نسبت نہ ہمیں غم سے فرار
روز کا اب یہ نیا عہدِ وفا رہنے دو

ہو چکے شہرِ نگاراں کے دریچے ویراں
کوئی پیغام نہ لائے گی صبا رہنے دو

کوچۂ عشق میں بے نام و نشاں ہے تشنہ
اس کو ناواقفِ آدابِ وفا رہنے دو

غزل

واقفِ مسلکِ رندانہ تو بن لینے دو
ہم کو خاکِ درِ میخانہ تو بن لینے دو

حاملِ مے نہیں ہو سکتا ابھی ظرفِ سفال
کوزۂ خام کو پیمانہ تو بن لینے دو

کب بھلا ہم نے پرستش سے کیا ہے انکار
اپنی محفل کو صنم خانہ تو بن لینے دو

ہم رکھیں گے غمِ جاناں کو دل و جاں سے عزیز
غمِ ایام سے بیگانہ تو بن لینے دو

دیکھنا ٹپکے گا ہر حلقۂ زنجیر سے خوں
نوگرفتار کو دیوانہ تو بن لینے دو

٭

حرفِ اظہار ہوں میں دل میں اتر جاؤں گا
صورتِ رنگِ حیا رخ پہ بکھر جاؤں گا

تو مجھے ڈھونڈتا رہ جائے گا منزل منزل
میں تو جھونکا ہوں دبے پاؤں گذر جاؤں گا

ڈوب جاؤں گا ہیں لمحوں کے سمندر میں تو کیا
قلزمِ وقت کو پایاب تو کر جاؤں گا

یہ مسافت کے کڑے کوس یہ راہوں کا عذاب
دشتِ بے سایہ کے آشوب سے مر جاؤں گا

لے اڑے گا مجھے پھر کوئی ہوا کا جھونکا
موجۂ ریگِ رواں بن کے بکھر جاؤں گا

اے سکوتِ شبِ غم کوئی صدا ہلکی سی
میں تو سناٹوں کی اس گونج سے مر جاؤں گا

کل کے خوابوں کی ہیں کرچیں مری آنکھوں میں ابھی
نیند کے زخم بھریں گے تو میں گھر جاؤں گا

شب کی آنکھوں سے ہوں ٹپکا ہوا آنسو تشنہ
میں کسی پھول سے عارض پہ ٹھہر جاؤں گا

اٹھی نہ کوئی قیامت خرامِ ناز کے بعد
کھلی نہ کوئی کلی غنچۂ دہن کی طرح

ترا کہا تو بصد شوق مان لوں واعظ
بہشت گر نہ ہوئی اس کی انجمن کی طرح

انا کے زخم گریباں کے تار تار میں ہوں
میں بزمِ گل میں تھا اب کنجِ بے بہار میں ہوں

یہاں تو جو بھی ملا اجنبی ملا مجھ کو
یہ شہر کون سا ہے میں یہ کس دیار میں ہوں

بجھا کے مجھ کو گزر جائے گا کوئی جھونکا
چراغِ رہ ہوں ہواؤں کے انتظار میں ہوں

کبھی ادھر سے گزر لے نگارِ شہرِ جمال
تجھے خبر بھی ہے میں تیری رہگذار میں ہوں

مری تلاش ہے جس کو وہ ڈھونڈ لے مجھ کو
گلوں کے رنگ میں ہوں نکہتِ بہار میں ہوں

دیا ہے طعنۂ واماندگی سبھی نے مجھے
میں آنے والے مسافر کے انتظار میں ہوں

عطا ہوئی تھی مسیحا کو جس کی پیش روی
صلیب اٹھائے ہوئے میں اُسی قطار میں ہوں

خود اپنے جسم کے مرقد میں دفن ہوں تشنہ
میں جی رہا ہوں مگر زیست کے مزار میں ہوں

☆

خونِ دل قتلِ تمنا ہو گا
عشق میں دیکھیے کیا کیا ہو گا

میری اس چاک گریبانی پر
شہر میں ایک تماشا ہو گا

اے مرے خواب کی تعبیر بتا
خواب تو نے بھی تو دیکھا ہو گا

جب کسی نے تری زلفوں میں کبھی
پیار سے پھول سجایا ہو گا

اشک آنکھوں میں بھر آتے ہوں گے
دل میں اک درد سا اٹھا ہو گا

آگیا ہو گا تجھے میرا خیال
جب ستارہ کوئی ٹوٹا ہو گا

تھا مجھی تک وہ ستم میرے بعد
پھر کوئی دل نہ دکھایا ہو گا

میرا دل توڑ کے تشنہ اس کو
پیار پتھر پہ بھی آیا ہو گا

اُٹھا ڈولا نئی نویلی دلہن کا
باج اٹھی شہنائی تیری یاد آئی

آنکھ ذرا جھپکی تو جلتے خوابوں نے
ایسی نیند اڑائی تیری یاد آئی

[illegible]

زمیں پہ تھے جو آسمان کیا ہوئے
وہ اپنے سارے مہربان کیا ہوئے

سمندروں میں جن سے ایک جشن تھا
وہ کشتیاں وہ بادبان کیا ہوئے

ہری بھری تھیں جن کے دم سے کھیتیاں
وہ عرق جبیں کسان کیا ہوئے

وہ کیا ہوئیں محبتوں کی بستیاں
مکیں وہ کیا ہوئے مکان کیا ہوئے

وہ جن کے دم سے تھیں لہو میں گردشیں
وہ شاعرانِ خوش بیان کیا ہوئے

کہاں گئیں شکاریوں کی ٹولیاں
بلندیوں کے وہ مچان کیا ہوئے

۵۷

یہ کس مقام پر حیات آ گئی
یقین وہ کیا ہوئے گمان کیا ہوئے

وہ زندگی کی آن بان کیا ہوئی
وہ نام کیا ہوئے نشان کیا ہوئے

جلا کے آئے تھے جو اپنے بادباں
وہ شیر دل جہازران کیا ہوئے

تراشتے تھے منزلیں جو دشت میں
وہ قافلے وہ سارباں کیا ہوئے

٭

پناہ گاہ کے اژدر کوئی نہ دیکھ سکا
چھپے ہوئے تھے جو خنجر کوئی نہ دیکھ سکا

لہو لہان تھا میں اور سب تماشائی
کدھر سے آئے تھے پتھر کوئی نہ دیکھ سکا

نظر لگائے رہے دوسرے کے قامت پر
کسی کو اپنے برابر کوئی نہ دیکھ سکا

ہر ایک شخص تھا اپنی ہوس کا زندانی
حصارِ ذات سے باہر کوئی نہ دیکھ سکا

سبھی نے دیکھا برستے ہوئے گھٹاؤں کو
ہوا ہے خشک سمندر کوئی نہ دیکھ سکا

سبھی سے داد ملی سرخروئی کی تشنہ
چلے جو رُخ پہ نشتر کوئی نہ دیکھ سکا

زمانے کی گردش سے جو ہٹا ہے
وہی اک شخص سولی پر کھنچا ہے

وہ جس کے ہاتھ میں پتھر ہے یارو
وہی اک شخص میرا آشنا ہے

خفا ہوتے ہیں کیوں احباب ہم سے
ہماری ذات تو اک آئینہ ہے

مجھے بھی اب تمہاری بے رخی پر
محبّت کا گماں ہونے لگا ہے

تمہیں بھولے ہوئے بیٹھا تھا لیکن
بہت یاد آئے تم جب دل دُکھا ہے

جگاؤ داورِ محشر کو تشنہ
سوا نیزہ پہ سورج آگیا ہے

×

لٹ گیا راہوں میں رختِ جاں بہت
ہو گئے ہم بے سر و ساماں بہت

رقص تھا آنکھوں میں ننگی روح کا
تھے لباسوں میں بھی ہم عریاں بہت

کیجئے اب جیب و داماں کا حساب
موسمِ وحشت کا تھا ارماں بہت

ہم اسیرانِ محبت کے لئے
اک تری آغوش کا زنداں بہت

دوستوں نے آخرش دل رکھ لیا
ہم کو لٹ جانے کا تھا ارماں بہت

تیرے وعدوں کا اسے ہے اعتبار
تشنہؔ عالمتاب ہے ناداں بہت

یہ قلزمِ حیات تو پایاب تھا مگر
ہر لمحہ میری فکر کو گہرائی دے گیا

پھر اس کے بعد کتنے مناظر نظر میں آئے
بے نور ساعتوں کو وہ بینائی دے گیا

مرہم بدست تھا جو بظاہر وہ آشنا
جانے لگا تو زخم شناسائی دے گیا

کیا غمگسار تھا کہ مرا حال پوچھ کر
کچھ اور دل کو رنجِ شکیبائی دے گیا

وہ محفلوں کی جان تھا رونق شبوں کی تھا
جو شخص مجھ کو تحفۂ تنہائی دے گیا

☆

نشاطِ گرمئ بزمِ خیال دیکھیں گے
دیئے بجھا کے ترے خدوخال دیکھیں گے

مسافتِ لب و عارض تمام ہے تو سہی
تجھے بھی اے روشِ ماہ و سال دیکھیں گے

بہار پر گلِ دوشیزگی ہے وصل کی شب
مآلِ حسن کا حسنِ مآل دیکھیں گے

بیاضِ حافظِ شیراز ہے رُخِ زیبا
ورق ورق پہ محبّت کی فال دیکھیں گے

لرزتے ہونٹوں پہ تمہیدِ التجا ہوگی
ھمکتی آنکھوں میں حسنِ سوال دیکھیں گے

نزولِ آیۂ دوشیزگی کے دن آئے
کتابِ عشق کا حرفِ کمال دیکھیں گے

بڑا ہے ناز تمہیں اپنے آپ پر تشنہؔ
تمہیں بھی ہم سرِ شہرِ جمال دیکھیں گے

ہم نے بھی کاٹا ہے راتوں کا عذاب
ہم بھی جل جل کے بجھے تاروں کے ساتھ
ہیں یہ بے موسم کی شب بیداریاں
رتجگوں کی رت گئی یاروں کے ساتھ

مسافت

غم نہ کر بیت جائے گا یہ سال بھی
تو زمانے کی تپتی ہوئی ریت پر
چلچلاتی ہوئی دھوپ کی آنچ میں
اپنے سانسوں کے پھوٹے ہوئے آبلے
یوں ہی گنتا چلا چل کہ یہ ساعتیں
بیت ہی جائیں گی

یہ بیاباں کی جلتی ہوئی دوپہر
یہ مسافت کے بے نام شام و سحر
ختم ہو جائیں گے
غم نہ کر بیت جائے گا یہ سال بھی
اور برسوں کی صورت (کہ جو وقت کی بے کراں
وسعتوں میں کہیں کھو گئے
نقشِ پا بھی نہیں اور نشاں بھی نہیں)

منزلِ بے نشاں کا مسافر ہے تو

یونہی چلتا چلا جا کہ یہ راستے
تیرے قدموں میں سمٹے چلے آئیں گے
روز و شب کے جھلستے ہوئے سلسلے
ٹوٹ ہی جائیں گے
غم نہ کر بیت جائے گا یہ سال بھی

تخلیق

مہیب رات کی یہ پُر سکوت تاریکی
ازل سے قبل کی تاریکیوں سے بھی تاریک
مہیب رات کی اس بیکراں سیاہی میں
مرے خیال میں اک روشنی در آئی ہے
میں اپنی فکر کی مسند پہ جلوہ آرا ہوں
مرے قلم میں عجب شانِ کبریائی ہے

ترغیب

تیرے دل میں بھی ہے تخلیق کا شوق
آفرینش کا مسلسل اک کرب
میں بھی اک ذوقِ نمو رکھتا ہوں
سینۂ سنگ میں ہو جیسے شرر پوشیدہ
سیپ کے بطن میں ہو جیسے گہر پوشیدہ

آ اسی جذبۂ تخلیق کی تکمیل کریں
آ کہ بن جائیں اسی خوابِ نمو کی تعبیر
ہم بھی آ رقص کریں رقصِ شرر ہونے تک
آبِ نیساں کے کسی قطرۂ آوارہ پہ
جو گذرتی ہے گذر جائے گہر ہونے تک

ہم رقص

مری جان ناچو مرے ساتھ ناچو
کہ تم میری ہم رقص ہو آج کی شب
ابھی کیا
ابھی رات کے دو بجے ہیں
ابھی رقص و نغمہ کی محفل جواں ہے
ابھی جاز کی گرم تانیں لہو میں تلاطم بپا کر رہی ہیں

ادھر دیکھو شوہر تمہارا
مسز گولڈ والا سے رومانٹک ہو رہا ہے
وہ کیا کہہ رہا ہے تمہیں اس سے مطلب؟
تمہارا یہ غصّہ بجا تو نہیں ہے
کہ وہ اس کی ہم رقص ہے آج کی شب
اسے حق ہے سرگوشیوں کا
محبت کا، نیکنگ کا، جلتے ہوئے قرب کا، حق ہے اس کو
کہ وہ اس کی ہم رقص ہے آج کی شب
میں شاید بہت پی گیا ہوں بہکنے لگا ہوں

مرے گرد باہوں کے حلقے ذرا تنگ کر لو
نہیں ردم میں آج اسٹیپس مرے
مگر اس سے کیا ہے میسر ہے مجھ کو
تمہارے سنہرے بدن کی تمازت
تمہاری یہ قربت
مرے جسم میں بجلیاں بھر رہی ہے
بہت خوبصورت بہت شوخ ہو تم
یہ لہجے کی نرمی یہ اکھڑی ہوئی سانس کیا کہہ رہی ہے
سمجھتا ہوں میں بھی
کہ تم میری ہم رقص ہو آج کی شب

☆

جنہیں بھلانے میں یارو بڑے زمانے لگے
جو دل دکھا تو وہی لوگ یاد آنے لگے

میں جس گلی سے بھی شہرِ جمال میں گذرا
کھِلے گلاب منڈیروں پہ مسکرانے لگے

دیارِ فکر میں یادوں کی دیویاں اُتریں
گئے دنوں کے فسانے بڑے سہانے لگے

ستم یہ کم تو نہیں ہے کہ اجنبی بن کر
مرے قریب سے گذرے تو مسکرانے لگے

ہمارے چہرے پہ کیا لکھ دیا محبت نے
تمام دوست ہمیں آئینہ دکھانے لگے

☆

بھولے بسرے خواب سہانے یاد آئے
آج وہ سارے یار پرانے یاد آئے

شہروں کی تہذیب تھی جن کی ہر لغزش
وہ سودائی وہ دیوانے یاد آئے

جھانک کے دیکھا جب بھی دل کے داغوں میں
کیسے کیسے آئینہ خانے یاد آئے

انجانا اک شخص ملا تھا آج مجھے
سب چہرے جانے پہچانے یاد آئے

یارانے کی دھوپ تھی جن کے چہروں پر
تم سے مل کر وہ بیگانے یاد آئے

کسی سے ملتے کسی کو جب دیکھا زشنہ
گئے دنوں کے سب افسانے یاد آئے

-۸-

کچھ رختِ سفر بھی ساتھ لے لو
رستے میں ہی رات ہو گئی تو

کیا ہو گئے چاند وہ تمہارے
اے شہرِ جمال کے دریچو

یہ تو نہیں چاہتوں کا لہجہ
اک بار تو پیار سے پکارو

کیا ہو گا جو آگ پھیل نکلی
ہمسائے کا گھر جلانے والو

بے نور اب ہو چلی ہیں صبحیں
کچھ شرم اے روشنی فروشو

کب تک یہ زمیں پہ سجدہ ریزی
اٹھو اور آسماں کو چھُو لو

وہ بھی نہ رہے جو سیج پر تھے
غمگین نہ ہو لحد کے پھُول لو

واقف ہے یہ ساری منزلوں سے
تیشہ کو بھی ساتھ ساتھ رکھو

ایک، تم کیا ہر کسی کے رو برو تھا آئینہ
جو ملا ہم کو وہ اپنا ہی تماشائی ملا

دیکھیے مانوس کب تک ہوں در و دیوار سے
گھر ملا ہم کو بھی لیکن غیر آبائی ملا

۱۷

تیری صورت کا یہ فسوں کب تک
آئینہ دیکھتا رہوں کب تک

قریہ قریہ اڑی ہے درد کی دھول
شہرِ بے مہر میں رہوں کب تک

کر لیا میں نے تار تار بدن
بے لباسی بھی اے جنوں کب تک

ضربِ تیشہ، فغانِ سنگ بھی سن
ضبطِ غم سے میں کام لوں کب تک

دوستو بزمِ شب نصیباں میں
روشنی کے لیے جلوں کب تک

بزم میں تیرے واسطے تشنہ
آخرش جامِ واژگوں کب تک

۲۸

تم ہوتے یا تم سا ہوتا
کاش کوئی تو اپنا ہوتا

پیار کا دعویٰ کرنے والو
میرا درد بٹایا ہوتا

ڈھلتی رات کی تنہائی میں
چُپکے سے تو آیا ہوتا

آخرِ شب زنداں میں کوئی
خوابِ گراں سے چونکا ہوتا

یہ تنہائی یہ سناٹا
زور سے دل ہی دھڑکا ہوتا

رکتے نہیں روکے سے آنسو
تم نے حال نہ پوچھا ہوتا

رخصت ہو کر جانے والے
مڑ کر بھی تو دیکھا ہوتا

تم مقتل میں ہی آ جاتے
کوئی تو وعدہ ایفا ہوتا

اپنی نیند کے رنگ محل میں
میرا سپنا دیکھا ہوتا

میں نے جو کچھ بھی سوچا ہے
دیواروں پر لکھا ہوتا

جانے کی جلدی ہی کیا تھی
تم نے تشنہ روکا ہوتا

غزل

لفظ و معنی میں کوئی ربط تو رکھا ہوتا
جو بھی کچھ تو نے کہا میں نے بھی سمجھا ہوتا

تجھ پہ بھی حشرِ جدائی کبھی گذرا ہوتا
مل کے تو بھی تو کسی شخص سے بچھڑا ہوتا

ہیں کہیں ناوکِ دشنام کہیں بارشِ سنگ
تو نے اس شہر کو مقتل نہ بنایا ہوتا

زلف و عارض کا تصور لب و رخسار کے خواب
یادِ جاناں مجھے دنیا کا بھی رکھا ہوتا

تجھ کو بھی وقت کی نبضوں کا تو ہوتا احساس
میں نے جو سوچا تھا دیواروں پہ لکھا ہوتا

جس سے خورشید کی پلکوں میں نمی آجاتی
عارضِ گل پہ میں شبنم کا وہ قطرہ ہوتا

ان چراغوں کے بجھانے سے رُکے گی نہ سحر
رات رکھنی ہے تو سورج کو بجھایا ہوتا

دیدنی تھا رقصِ طاؤسِ جوانی گاؤں میں
جیسے پہنا دے کوئی جھانجھن ہوا کے پاؤں میں

مت گھٹا قامت کو اپنے پیکرِ دیوارِ دوست
ہم مسافر تھک کے آ بیٹھے ہیں تیری چھاؤں میں

وقت کے چارہ گر.....

اپنے زخموں کو ہونے نہ دو مندمل
اپنے چہروں پہ یہ دھول رہنے بھی دو
روح کی ان خراشوں سے رسنے بھی دو تازہ تازہ لہو
انگلیاں گر الجھتی ہیں تارِ گریباں سے تو کیا ہوا
اپنے جیب و گریباں کی یہ دھجیاں
اپنے سینے پہ یونہی سجائے رکھو
یہ ہیں یادیں اسی جہدِ ناکام کی
جس نے قالب تو کیا روح کو بھی ڈسا
اور سنگین بوٹوں تلے میری عظمت مرا عزم روندا گیا

وقت کے چارہ گر چارہ سازی نہ کر
میرا یہ درد اب لا دوا ہو گیا
روح کا زخم رستا ہے رستا رہے
روح کے زخم کا کوئی مرہم نہیں

موسمِ بے رنگ

آگئی پت جھڑ کی رُت
پتیاں بارش کی بوندوں کی طرح
ٹوٹ کر پیڑوں کی باہوں سے گریں
رزقِ زمیں ہونے لگیں
پیڑ نوزائیدہ بچوں کی طرح
بے لباسی میں مگن

آگئے دوشیزۂ فطرت کی عریانی کے دن
کھل گیا بندِ قبا
دھجیاں بن کے اڑا ملبوسِ گل

سبز پریاں زرد چادر اوڑھ کر
موسمِ بے رنگ کی آغوش میں سہمی ہوئی
آخری سانسوں کی گنتی کرتے کرتے سو گئیں

دستک

میری تنہائیوں کے مرقد میں
کس کے قدموں کی چاپ اتری ہے
توڑنے کو سکوتِ شب کا طلسم
کس کے سانسوں کی آہٹیں گونجیں

رات کی اس سیاہ بستی میں
صبحِ بے نام کی کرن لے کر
یہ دبے پاؤں کون آیا ہے

سرد راتوں کی یخ ہواؤں سے
زرد پتوں کی ہڈیاں چیخیں
بس یہ سمجھا کسی کے پاؤں تلے
راستوں کی اداسیاں ٹوٹیں
بس کہ ہوں آج بھی اسیرِ گماں
ہیں کہ ہوں اپنے وہم کا زنداں!

چاہت

تمہیں نہ چاہیں تو کس کو چاہیں
تمہارے رنگیں بدن کی قوسیں
لچک لچک کر دھنک سجائیں
گھٹا لٹائیں

تمہارے سینے کے زیر و بم سے
ہزاروں طوفان سر اٹھائیں
تمہاری آنکھیں کلیل کرتے ہوئے غزالاں
تمہاری پلکیں سلونی شاموں پہ رات کا سرمئی جھکاؤ
تمہارے ابرو کھنچی ہوئی دو حسیں کمانیں

تمہارا پیکر
بھڑکتے شعلوں کی خوبصورت اٹھان جیسے
تمہارے عارض
گلاب کی نرم نرم کلیاں
گلال اڑائیں

شفق لٹائیں
نشہ پلائیں
تمہیں نہ چاہیں تو کس کو چاہیں

یہ جبر کم تو نہیں ہے کہ آپ کی خاطر
تمام شہر سے ہم دوستی نبھاتے رہے

جلتی بارش

کتنی تیز بارش ہے
اور میں اکیلا ہوں

ہم نے کتنی برساتیں ساتھ ساتھ کاٹی تھیں
کیسے کیسے طوفاں سے
ساتھ ساتھ گذرے تھے

آج میں اکیلا ہوں جل رہی ہے تنہائی
نرم نرم بستر پہ
گرم گرم پہلو میں تو بھی جل رہی ہوگی

فرق ہے سلگنے میں
تیرے میرے جلنے میں
کتنی تیز بارش ہے
ہر طرف اندھیرا ہے
اور میں اکیلا ہوں

لمس

ان آنکھوں کی نیل جھیل میں
اترا چاند کنول کا روپ
دہک اٹھا کندن سا پنڈا
بکھر گئے جذبات
انگ انگ سے نغمے پھوٹے
گونجی لہو میں بین
چٹکی ہونٹوں پر چنگاری
دھڑکا من میں پیار
تیز ہوئی سانسوں کی آندھی
ناچا لہو بدن میں
دوڑ گئی گالوں پر لالی
جھک گئے باورے نین
ڈھلک گیا سینے سے آنچل
بھڑکی جوبن آگ
من میں ناچیں دیو داسیاں

چھنک اٹھی پازیب

سیّاں انجانے میں تو نے
چھوا تھا میرا ہاتھ
ایسا دھڑکا لگا تھا من کو
سوئی نہ ساری رات

ویسی ہی بو باس تھی باسی پھولوں میں
دیکھی سیج پرائی تیری یاد آئی

رات نے کنکر ڈالے میری آنکھوں میں
نیند کِسے پھر آئی تیری یاد آئی

وہ کہ ہر عہدِ محبت سے مکرتا جائے
دل وہ ظالم کہ اسی شخص پہ مرتا جائے

میرے پہلو میں وہ آیا بھی تو خوشبو کی طرح
میں اسے جتنا سمیٹوں وہ بکھرتا جائے

کھلتے جائیں جو ترے بندِ قبا زلف کے ساتھ
رنگِ پیراہنِ شب اور نکھرتا جائے

مشتہر ہو کے بڑھے اور نکونامیٔ عشق
دل بھی شائستۂ غم ہو کے سنورتا جائے

عشق کی نرم نگاہی سے حنا ہوں رخسار
حسن وہ حسن جو دیکھے سے نکھرتا جائے

کیوں نہ ہم اس کو دل و جان سے چاہیں تشنہ
وہ جو اک دشمنِ جاں پیار بھی کرتا جائے

۷۸

قریۂ جاں کو اندھیروں سے بچائے رکھنا
دل کی قندیل ہواؤں میں جلائے رکھنا

زندگی کو کہیں مل جائے نہ ساحل کا سکوت
تم ہر اک موج میں طوفان اٹھائے رکھنا

کوئی آئے گا اٹھائے ہوئے کاندھے پہ صلیب
آج مقتل کے در و بام سجائے رکھنا

گرمیٔ شہرِ محبت ہے اسی کے دم سے
دل کی محفل کو بہر رنگ جمائے رکھنا

وہ مرا ان سے شکایت بھی نہ کرنے کا خیال
اور وہ ان کا نگاہوں کو جھکائے رکھنا

قافلے گذریں گے بے حال ادھر سے یارو
دشتِ آشوب میں تم سائے بچھائے رکھنا

کون دنیا میں شریکِ غمِ دل ہوتا ہے
اپنا غم اپنے ہی سینے میں چھپائے رکھنا

کچھ نشانی تو رہے موسمِ گُل کی تشنہ
ایک پتہ تو ہواؤں سے بچائے رکھنا

کوئی آئے ادھر بھی سنگ بدست
شیشۂ دل سجائے بیٹھے ہیں
ہم کو ہونا ہی تھا خرابِ جنوں
آپ کیوں سر جھکائے بیٹھے ہیں

۲۸

کس نے دروازۂ احساس پہ دستک دی ہے
گنبدِ ذات میں پھر ایک صدا گونجی ہے

لوحِ دل پر تو محبت سے مرا نام نہ لکھ
موجۂ ریگ پہ تصویر کہاں رہتی ہے

تیری آواز کھنکتی ہے سرِ پردۂ جاں
دشتِ دل میں جرسِ گل کی صدا آتی ہے

اب بھی کچھ سنگ ادھر آنے ہیں گا ہے گا ہے
شہرِ خوباں میں ابھی رسمِ وفا باقی ہے

دل کو آجاتا ہے سوکھے ہوئے پتوں کا خیال
کانپ جاتا ہوں میں جب تیز ہوا چلتی ہے

کیا کہیں دامنِ گل چاک ہوا ہے یارو
خاک اڑاتی ہوئی کیوں موجِ صبا گذری ہے

ناز ہے مجھ کو بھی اعجازِ مسیحائی پر
میں نے الفاظ میں احساس کی جاں ڈالی ہے

تیرے ہاتھوں میں ہی اب سنگ سجیں گے تشنہؔ
ہم نے ہی آئینہ خانوں کی بنا رکھی ہے

اک پیکرِ جمال تھا شریکِ جان و تن
مہک رہا تھا نکہتِ وصال سے بدن
نزول ہو رہی تھیں روشنی کی آیتیں
پیمبرِ خدا تے نور تھی کرن کرن

تو پھول پھول رہے خوشبوؤں کے آنچل میں
میں خار خار ہوں آبلوں کے جنگل میں

ترا بدن کہ ترے پیرہن سے چھنتا ہے
کہ جیسے چاندنی لپٹی ہو سرخ ململ میں

مری سحر کے اجالے ہیں تیرے عارض پہ
مری شبوں کی سیاہی ہے تیرے کاجل میں

ہجوم ماہ وشاں تھا وفا کے پنگھٹ پر
بدن کی پیاس بھری تھی سبھی کی چھاگل میں

نیم شب کے مسافر بتا کدھر جائیں
چھپا لیا ہے چراغوں کو تو نے آنچل میں

ہر ایک شاخ کے دل میں ہے رنگ و بو کی تڑپ
نمو کا ذوق ہے رقصاں ہر ایک کونپل میں

یہ آج چھوٹی ہے کس کے لہو کی مہتابی
یہ کس نے جشنِ چراغاں کیا ہے مقتل میں

تو اس زمین میں چنگاریوں کی فصل نہ بو
اُگی جو آگ تو پھیلے گی سارے جنگل میں

زمیں کی پیاس بجھے بھی تو کس طرح تشنہؔ
کہ ایک بوند بھی باقی نہیں ہے بادل میں

تشنہؔ بہ امیرِ شہرِ دولت
سب کچھ ہی سہی خدا نہیں ہے

☆

نہ دوستی نہ محبت نہ آشنائی گئی
ہمارے ساتھ ہماری شکستہ پائی گئی

وہ جس کا نام قیامت رکھا ہے دنیا نے
اٹھے گی تیری گلی سے اگر اٹھائی گئی

بنا کے عالمِ ہستی کو آئینہ خانہ
مری شبیہہ مجھے بارہا دکھائی گئی

کیا ازل سے مجھے گنبدِ حیات میں بند
وہ بازگشت ہوئی تابِ لبِ کُشائی گئی

اٹھے ہیں لوگ باندازِ خود شناسائی
امیرِ شہر بس اب تیری پیشوائی گئی

٭

کیا کھلیں دریا کے جوہر دشت میں
ریت کا ہے اک سمندر دشت میں

روشنی بھی آگ برسانے لگی
آ گیا سورج بھی سر پر دشت میں

گلستاں ہے برگدوں کی چھاؤنی
قد نکالیں گے صنوبر دشت میں

چھوڑ آئے کب کا شہرِ آشنا
کون برساتا ہے پتھر دشت میں

خواب کے صورت گرو دیکھو مجھے
مجھ سے ہیں یہ سارے منظر دشت میں

دیدنی ہے یہ بگولوں کا دھمال
ہیں صبا کے اور تیور دشت میں

انجام

یاد آتی ہیں بہت وہ خوبصورت لڑکیاں
وہ وفا کے دیس کی نازک بدن شہزادیاں
جن کے ہونٹوں پر تھے نغمے پیار کی تقدیس کے
شرم کی خوشبو سے جن کے جسم تھے مہکے ہوئے

وہ وفا کے دیس کی نازک بدن شہزادیاں
وہ سنہرے جسم چندن کی مہکتی ڈالیاں
وہ اچھوتی کنیائیں شوخ، چنچل دیویاں
جانے کن باہوں کی قبروں میں وہ دفنا دی گئیں
جانے کن محلوں کی دیواروں میں چنوا دی گئیں

روگ

میں نے دل لگایا تھا
روگ تو لگا بیٹھی
تو میری محبت کو
زندگی بنا بیٹھی

یہ پہاڑ سی راتیں
اور تو اُدھر تنہا
درمیاں کی دیواریں
کون اب گرائے گا
میں تجھے بھلا بیٹھا
تو بھی بھول جا مجھ کو
زندگی میں وعدوں کی
ایسی پاسداری کیا

گردِ ملال

وہ کھڑکیاں وہ دریچے وہ بام و در کہ جہاں
کبھی ستارے کبھی پھول مسکراتے تھے

جہاں تنکا رہوا تھا ہزاروں بار یہ دل
جہاں گلاب سے چہرے دھنک سجاتے تھے

وہ کھڑکیاں بھی ہیں ویران وہ دریچے بھی
نہ وہ گلاب سے چہرے نہ اب وہ پھول نہ چاند

کہ آج سب وہ مناظر خیال و خواب ہوئے
محبتوں کے وہ لمحے بڑے عذاب ہوئے
ملی ہے وقت نے گردِ ملال چہروں پہ

ہنسی کا زخم

اس نے میرے کان میں
اک بات چپکے سے کہی
اور ہنس پڑی

میں اسی اک بات کو
تنہائی کے لمحات میں
دُہرا کے اکثر رو دیا

۸۰

کہو یارو تمہیں کیسا لگے ہے
وہ ظالم جو مجھے اچھا لگے ہے

مہینے بھر ہیں یہ مہتاب لوگو
بس اک دو دن ہی اُن جیسا لگے ہے

جہاں بھٹکا تھا میں پہلے بھی اے دل
مجھے تو یہ وہی رستہ لگے ہے

قیامت پھر کوئی ٹوٹے گی دل پر
مجھے اک اجنبی اپنا لگے ہے

ہے عبرت کو مآلِ گُل ہی کافی
مجھے ہنستے ہوئے ڈر سا لگے ہے

وہ ہے اک بابِ تاریخِ گلستاں
تمہیں جو برگِ آوارہ لگے ہے

غضب لوگو محبت آشنا دل
اسے اترا ہوا شیشہ لگے ہے

خدا رکھے مرا وہ دشمنِ جاں
مجھے تو جان سے پیارا لگے ہے

نہ جانے تم نے کیا تشنہ میں دیکھا
ہمیں تو کوئی دیوانہ لگے ہے

کروں حساب میں گذرے ہوئے زمانے کا
اگر یہ قافلۂ روز و شب ٹھہر جائے

ہمارے پاس وہی دل امینِ دولتِ غم
وہ دل جو آپ کے پہلو میں سنگ کہلائے

☆

اس نے بھی دلداری کی
جو میرا غمخوار نہ تھا

میرے قامت سے اونچا
کوئی ستونِ دار نہ تھا

کب ہم سے اس زنداں میں
جشنِ صلیب و دار نہ تھا

لوگو ہم تھے سولی پر
مقتل میں تہوار نہ تھا

اس رستے پر بھٹکے ہم
جو رستہ دشوار نہ تھا

اس رستے پر چل نکلے
جو رستہ ہموار نہ تھا

بڑی بڑی دستاروں میں
ایک بھی تو سردار نہ تھا

ناموں کی فہرستیں تھیں
جذبوں میں ایثار نہ تھا

بزم میں خوش گفتار کوئی
محروم گفتار نہ تھا

محفل تھی وہ یاروں کی
شاہوں کا دربار نہ تھا

ہم خود اپنے دشمن تھے
کوئی پس دیوار نہ تھا

☆

پتی پتی بکھر گئی
اتنی مہنگی ایک ہنسی

کتنے دکھ دے جاتی ہے
یاد کوئی بھولی بسری

جس کو چاہا تھا میں نے
مورت تھی وہ پتھر کی

پھر نہ کبھی دیکھا اس کو
دید کی محفل پھر نہ جمی

شام کے دھندلے ساحل پر
ملی تھی ہم کو اک لڑکی

ننگے پاؤں وہ سردی میں
ٹھنڈی ریت پہ بیٹھی تھی

بدن سنہرا کندن سا
تپی ہوئی وہ چاندی تھی

سلگ رہی ہے تن من میں
اس کے سانسوں کی گرمی

لرز رہے تھے لب اس کے
آنکھیں تھیں بھیگی بھیگی

میخانوں کے بس کی نہیں
تشنہ تیری تشنہ لبی

جو بات سرِ خلوتِ جاں ہم نے کہی ہے
ہونٹوں پہ وہی بات سرِ دار بھی ہو گی

٭

ہم تم روز ہی ملتے تھے
جذبے کتنے سچے تھے

پیار کی پہلی بارش میں
دیر تلک ہم بھیگے تھے

جسم کا جنگل پیاسا تھا
روح پہ بادل برسے تھے

دیر تلک خاموشی سے
دونوں چاند کو تکتے تھے

پھر اپنی خاموشی پر
ہم دونوں ہنس دیتے تھے

تنہائی کے صحرا میں
یادوں کے سناٹے تھے

میرے گھر کے آنگن میں
کتنے پتھر بکھرے تھے

اب وہ مجھے لوٹا دینا
جو خط تم کو لکھے تھے

بیچ سمندر میں رہ کر
بوند بوند کو ترسے تھے

پتہ چلا تعبیروں سے
جھوٹے سپنے دیکھے تھے

دیر تلک ہم راتوں کو
تیرا رستہ تکتے تھے

تشنہ جن سے چشمک تھی
وہ سب یار پرانے تھے

☆

گرمی سی ترے جسم کی محسوس ہوئی ہے
گھبرا کے کئی بار مری آنکھ کھلی ہے

آیا ہے وہ خورشید قبا خلوت جاں میں
یہ پیرہنِ شب کے مسکنے کی گھڑی ہے

کھینچے ہے تصور لب و رخسار کے نقشے
دیکھا نہیں اس کو مگر آواز سنی ہے

آئے ہیں دریچوں میں نظر چاند ستارے
جس سمت سے گزرا ہوں بڑی دھوم مچی ہے

اے شہرِ نگاراں کے سفیرو مجھے دیکھو
اک عمر مری زہرہ جمالوں میں کٹی ہے

وہ لڑکی

دور کسی انجان نگر میں
نین کنول کے دیپ جلائے
جانے کیا کیا آس لگائے
وہ مرا رستہ تکتی ہے
وہ لڑکی کتنی بھولی ہے

بچھڑے میت کہیں ملتے ہیں
کون اسے یہ بات بتائے
جینے کے انداز سکھائے

ہوا کا لہجہ

یہ کاروبارِ چمن ہے ہوا کے لہجے پر
ہوا جو غیظ میں آئے تو
خاک اڑنے لگے
ہر ایک پودے کا ننھا سا دل دہلنے لگے
ہر ایک شاخ ہو لرزاں شجر ہراساں ہوں

ہوا کا نرم ہو لہجہ
تو پھول کھلنے لگیں کونپلیں مچلنے لگیں
ہر ایک شاخ کے پیروں میں گھونگرو چھنکیں
ہر ایک پیڑ سے نغموں کی مستیاں برسیں
نظر لگائے رہو تم ہوا کے لہجے پر

☓

مجھ سے منہ پھیر کے جانے والے
کیا کہیں گے یہ زمانے والے

تو مری سوچ سے بڑھ کر نکلا
رشتۂ درد نبھانے والے

کیا ہوئے تیری گلی کے وہ لوگ
وہ جو تھے حشر اٹھانے والے

مجھ کو بھی اذنِ تبسم دیتا
باغ میں پھول کھلانے والے

تو مری روح میں اترا ہوتا
میرے پہلو میں سمانے والے

میری دنیا میں اندھیرا کیوں ہے
ماہ و خورشید بنانے والے

اب نہیں تابِ سماعت مجھ میں
قصۂ دَرد سنانے والے

آخرش سیکھ لیے تو نے بھی
سارے انداز زمانے والے

بن کے تعبیر بھی آیا ہوتا
نت نئے خواب دکھانے والے

خمیازہ

"آپ ارے اس وقت یہاں
اندر آ جائیں
دن کو ہمارے گھر آنے کی زحمت کیسی
یہ گھر تو راتوں کو ہی اچھے لگتے ہیں

اور ہم
جگمگ روشنیوں میں جھلمل کرتے کھلونے ہیں
راتوں کو ہی جن سے کھیلا جاتا ہے
میری آنکھوں کے یہ حلقے
راتوں کو کم سونے کا خمیازہ ہیں"

وعدہ

(ماخوذ)

حسبِ وعدہ میں نے دروازے پہ دستک دی
چھناکا سا ہوا
بام و درچونکے خموشی کلبلا کر رہ گئی
گنبدِ کہنہ کے گوشوں سے ابابیلیں اڑیں

پھر وہی خاموشیوں کا اک سکوتِ بے کراں
اور میں صحرا کے واماندہ مسافر کی طرح
اپنے مستقبل کی ناہموار راہوں پر چلا
دور تک آتی رہی ماضی کے رونے کی صدا

۶

ہوائے درد کچھ ایسی چلی تھی
طنابِ خیمۂ جاں کھنچ رہی تھی

کسی کو مہرباں سمجھا تھا ہم نے
وہ ساری خواب کی صورت گری تھی

چلی اب حسرتیں بھی شہرِ دل سے
یہ بستی کتنی مشکل سے بسی تھی

جہاں دیکھا تھا اکدن چاند ہم نے
وہ کھڑکی آج بھی سونی پڑی تھی

جو تھی اک دن ملاقاتوں کی جنّت
وہ شاید میری خوابوں کی گلی تھی

جلوسِ عاشقاں نکلا تھا تشنہ
تماشے کو بڑی خلقت کھڑی تھی

۲۶

قریۂ جاں تجھے ہم یاد تو آتے ہوں گے
کبھی افسانوں کی صورت کبھی خوابوں کی طرح

دوستو یہ بھی محبت کی جزا ہے شاید
ہم پہ ہر لمحہ گذرتا ہے عذابوں کی طرح

آگہی جہلِ نمائش کے بہت کام آئی
ہم سجائے گئے طاقوں میں کتابوں کی طرح

سرخروئی تو مقدر ہے اُسی کا یارو
جو کفِ خار میں کِھلتا ہے گلابوں کی طرح

وہ کہ جن سے تھی کبھی انجمن آرائی شب
ہم سے اب ملتے ہیں وہ بند کتابوں کی طرح

ظرفِ ہر جام کا ہم دیکھ چکے ہیں تشنہ
ہم ہر اک بزم میں چھلکے ہیں شرابوں کی طرح

شراپ

تجھے بھی پھونک کے رکھ دے یہ شعلۂ افکار
ترا بدن بھی مجسّم شرار بن جائے
عذابِ زیست میں ہو تو بھی مبتلا اک دن
جو پھول ہاتھ میں آئے وہ خار بن جائے
ہوں تیرے جیب و گریباں بھی تار تار اک روز
ترے لیے ترا جھولا بھی دار بن جائے
یہ بد دعا ہے مری تو بھی ہو اسیرِ وفا
جو تیرے دل میں ہے نفرت وہ پیار بن جائے

آدرش

تو بھی ایسا گیت گا
جس میں میرے دور کی خوشیاں بھی ہوں اور غم بھی ہوں
وہ خوشی جو روح کی پہنائیوں میں
(زندگی کی شعلہ سامانی کے ساتھ)
شبنمی سا لمس دے
لمس پہلی رات کی دلہن کی نرم آغوش کا

اور وہ غم
جیسے اک ماں اپنے اکلوتے جواں بیٹے کی ٹھنڈی لاش پہ
ہو نوحہ خواں
وہ فغاں وہ آہ جو پتھر کو بھی پانی کرے
تو بھی ایسا گیت گا

ہر ایک سانس پہ پہرہ بٹھا دیا جائے
فضا میں دامِ سماعت بچھا دیا جائے

یہ حکم ہے کہ مقفّل ہوں سارے دروازے
تمام شہر کو زنداں بنا دیا جائے

جو لب کشا ہو کوئی کاٹ دو زباں اس کی
جو سربلند ہو وہ سر جھکا دیا جائے

کوئی چراغ سرِ شام ہو کہیں روشن
چلی ہے رسم کہ وہ گھر جلا دیا جائے

بلاؤ پھر سرِ مقتل مرے رقیبوں کو
حسابِ قرضِ رفیقاں چکا دیا جائے

جو رہزنوں سے بچا لائے تھے وہ نقدِ حیات
بنامِ قسمتِ یاراں لُٹا دیا جائے

شرر کی آگ سے پگھلا نہ پتھروں کا وجود
غرورِ سنگ کو تیشے سے مٹا دیا جائے

چاندنی اب بھی کھلتی ہے کیا بام پر
وصل کی چاند راتوں کا کیا حال ہے

مطلعِ ماہ و خورشید تھے جو کبھی
اُدھ کھلے ان دریچوں کا کیا حال ہے

گجر

تم بھی جاگو نیند کے ماتو
جاگو ہوا سویرا

باج رہے ہیں بھور کے کنگن
پھیلا اجیاروں کا کندن
ڈھلک گیا دھرتی کے سر سے
اندھیاروں کا رین دوشالا
پورب کے آکاش پہ ناچی
کرنوں کی چنچل مدھو بالا

اک اک کر کے چاند ستارے
نیل جھیل میں ڈوبے
سر پہ پہنے مکٹ سنہرا
سورج دیو براجے
ڈال ڈال پہ چہکے پنچھی
پنکھ بکھیرو جاگے

ٹوٹ گئی نندیا کی مالا

پورب پر پھر جوبن آیا
پچھم کے دن بیتے
خالی پیٹ یہ ہمت والے
بانکے چھیلے جیتے
مست فضاؤں میں لہرایا
پھر گلنار پھریرا
تم بھی جاگو نیند کے ماتو
جاگو ہوا سویرا

—٭—

مثالِ موجِ صبا ہم چمن میں آئے تھے
بہار بن کے تری انجمن میں آئے تھے

غبارِ شام و سحر تھا ہمارے چہرے پر
ہم آفتاب تھے لیکن گہن میں آئے تھے

شکستہ گام لہو پیرہن رسن بہ گلو
شکار ہو کے غزالاں ختن میں آئے تھے

لُٹا کے قافلۂ جاں بنامِ دیر و حرم
غریبِ شہر، دیارِ وطن میں آئے تھے

ہنسا تھا ہم پہ بھی تشنہ ہجوم کم نظراں
لئے صلیبِ سخن شہرِ فن میں آئے تھے

٭

مآلِ صبحِ بہاراں تمہیں مبارک ہو
یہ چاک چاک گریباں تمہیں مبارک ہو

شکستِ گوہرِ شبنم پہ رو رہا ہوں میں
تبسّمِ گلِ خنداں تمہیں مبارک ہو

لہو لہو یہ اجالا یہ زخم زخم چراغ
یہ جشنِ شامِ شبستاں تمہیں مبارک ہو

شکستِ آئینۂ دل نے یہ صدا دی ہے
یہ شورِ بزمِ نگاراں تمہیں مبارک ہو

ہمارے ساتھ ہے تشنہ ہجومِ دل زدگاں
جلوسِ تختِ سلیماں تمہیں مبارک ہو

غزل

غزالِ شوق ہے آوارۂ ختن کب سے
عذابِ زیست میں ہے پیکرِ بدن کب سے

میں جبرِ ذات کے بن میں ہوں کب سے آبلہ پا
ہے تار تار انا کا یہ پیرہن کب سے

اداس چہروں پہ لکھی ہوئی ہے محرومی
ہے بے چراغ دلوں کی یہ انجمن کب سے

دیا گیا ہے مجھے اپنے آپ میں بن باس
دیارِ ذات میں پھرتا ہوں بے وطن کب سے

کبھی تو موجۂ ابرِ کرم ادھر بھی نظر
ترس رہا ہے بہاروں کو یہ چمن کب سے

کہیں ہیں دار کی باتیں کہیں صلیب کا ذکر
ہے درمیاں میں ہی یہ قصہ رسن کب سے

میں اپنی فکر کے زنداں میں قید ہوں تشنہ
ہے بندِ طوق و سلاسل مرا سخن کب سے

ہم بھی ہیں اے دوستو سورج مگر
اپنے عکسِ ذات سے گہنا گئے

کس کو بخشا ہے غبارِ وقت نے
کیسے کیسے آئینے دھندلا گئے

انتظار

میرا یہ بے روح سا پیکر
پت جھڑ کے موسم میں اک سوکھا سا شجر
بے برگ و ثمر
روز و شب کے تپتے ہوئے میداں میں ہے کب سے
موسمِ گُل کی آس لگائے
کوئی ہوا کا نرم سا جھونکا
مجھ میں سمائے
پھول کھلائے
کونپل کونپل خواب جگائے
ڈالی ڈالی جھومے گائے
میرے دل میں جینے کا ارمان جگائے
میرے دکھوں کا کوئی مداوا کوئی علاج
کوئی تو آئے!

٭

ارادہ جب بھی کرتا ہوں سفر کا
خیال آتا ہے تیری رہگذر کا

نہ ٹھہرائے سے ٹھہرا شہرِ دل میں
وہ باسی تھا نہ جانے کس نگر کا

کوئی سورج مقابل آ گیا ہے
شجر سے بڑھ گیا سایہ شجر کا

اسی جانب رواں ہے شہر سارا
یہی رستہ ہے شاید تیرے گھر کا

نہ طے ہم سے ہوا جو زندگی بھر
وہ سارا فاصلہ تھا اک نظر کا

سبھی ہیں اجنبی تیری گلی میں
پتہ اب کس سے پوچھوں اپنے گھر کا

☆

میں بھی تنہا تھا اور رات بھی تھی
تو جو آتا تو کوئی بات بھی تھی

وہ نظر ہم سے جو کبھی نہ ملی
وہ نظر جانِ التفات بھی تھی

ایک پل میں بدل گئی دنیا
تو بدلتا تو کوئی بات بھی تھی

کیا قیامت کہ تیرے عشق کے ساتھ
مجھ پہ پابندیٔ حیات بھی تھی

تھا وہ جس دم شریک خلوتِ جاں
وہ گھڑی شرحِ کائنات بھی تھی

جانے کیا ہو گئے وہ دن تشنہؔ
جب محبت شریکِ ذات بھی تھی

گوری تو نے من پنچھی پر پھینکا پریم کا جال
پیروں میں زنجیریں ڈالیں کھول کے اپنے بال

آری گوری مد ورا پی کے پریت کی ریت نبھائیں
ایسے ڈوبیں اک دوجے میں دونوں اک ہو جائیں

پریت کی آئی رت البیلی جوبن رس برسائیں
سمے کی چادر اوڑھ کے گوری آ دونوں سو جائیں

طوفانوں سے ناؤ پرانی کیسے اترے پار
دونوں اپنے یار پرانے مانجھی اور منجدھار

اپنا اپنا رنگ اڑائیں جوبن رنگ بہار
پریت کے بھاگوں آیا گوری ہولی کا تہوار

چڑھتی ندیا پھیلتی اگنی جوبن کا یہ زور
پریتم کے سنگ کھیل رچاتے ہو جائے نا مجبور

دونوں ہی بے قابو تھے وہ کیسا تھا بھونچال
دونوں ہی کی سانسیں اکھڑیں دونوں ہی بے حال

جھیلوں جیسی تو گہری ہے تیری نہیں مثال
گوری تجھ میں ڈوب کے میں نے دیکھی جوبن تال

جوبن کے پر تولتے پنچھی اڑنے کو بے چین
پنجرے کا پٹ کھول دے گوری بیت نہ جائے رین

نار پرائی سیج کسی کی سدا ہی من کو بھائے
کلی کلی کو چوم کے بھونرا پیاسا ہی رہ جائے

کون اب آئے گا رے کاگا کاہے شور مچائے
بچھڑا ساجن اڑتا بادل کبھی نہ لوٹ کے آئے

کوار کا بادل ڈال کا پنچھی پردیسی کی پریت
یہ تینوں ہرجائی رے گوری نہیں کسی کے میت

چھٹا رہی تھی ندیا پلکوں سے پیروں کی دھول
چنچل لہریں چوم رہی تھیں چرن کنول کے پھول

پیار چھپائے کب چھپتا ہے کہہ دے من کی بات
ساجن کی تو آس لگائے سوئی نہ ساری رات

ہار سنگھار میں رچی ہوئی تھی ہائے رے موری چنری
سانوریا نے پریم رنگ میں رنگ دی کوری چنری

توڑے پنچھی ڈال ڈال کا توڑے اڑتا بادل
اپنے رنگ میں رنگ نہ ساجن میرا کورا آنچل

چڑھتے سورج کے گُن گاتا نیا اُتم کاج
اتی مہان ہے کویتا نیزی تشنہ تو کویراج

رنگ محل میں آگ لگا دی بالک بڑے شریر
انگنائی میں پھینک رہے ہیں انگاروں کے تیر

ڈالی ڈالی سلگ رہی ہے مچی ہے ہاہاکار
پھیل رہی ہے باغ میں اگنی چھیڑے کوئی ملہار

پگ پگ شعلوں کا لپکا ہے قدم قدم ہے آگ
کون باورا چھیڑ گیا اس رت میں دیپک راگ

یہ تنہائی یہ سناٹا گہرے موت کے سائے
اپنے سانسوں کی آہٹ بھی اب تو من دہلائے

دیتے ہیں یہ دنیا والے دانی کو دھتکار
جگ کے ہاتھوں سدا ہوا ہے پاپی کا اپکار

جھوٹی ریت ہے پریم نگر کی جھوٹ یہاں کا پیار
کس کی کارن کیا ہے گوری تو نے ہار سنگھار

پاپی سارے سنگھی ساتھی پاپی سب سنسار
کشٹ کرودھ ہے جیون بھر کا، پل دو پل کا پیار

ساجن کے سپنوں میں کھوئی بیٹھی تھی اک نار
برس رہی تھی جلتے پنڈے پر ساون کی پھوار

چھیڑ چھاڑ کی رت ہے گوری آؤ کھیل رچائیں
کانہا کی رہ دیکھ رہی ہیں پنگھٹ پہ رادھائیں

تو چمپا کی مدھر کلی ہے تو چندن کی ڈالی
لوٹ لیا ہے تو نے من کو سندر نینوں والی

نین ہیں کاجل مانگ ہیں تارے ہونٹوں پہ مسکان
پیار سے مانگ رہی ہے گوری پریم کا جیون دان

شہروں کی ہے ریت پرانی پیار کو دیں بن باس
میری بھی اب کتھا لکھے گا کوئی تلسی داس

تو بھی چاند کو تکتی ہو گی راتوں کو چپ چاپ
نت ہی گوری ہوتا ہو گا اپنا نین ملاپ

لاکھ سمیٹا آنچل لیکن مچل گئے جذبات
ہونٹ تو چپ تھے دیا کل نیناں کہہ گئے ساری بات

شیتل جل میں دہکتا پنڈا لگا رہا تھا آگ
دیکھ کے جوبن کی لہروں کو جاگے ندی کے بھاگ

مشکل ہے اس جگ میں گوری دل سے دل کا میل
شیش محل میں کھیل رہی ہے تو پتھر کا کھیل

چھوٹ گیا ہاتھوں سے درپن رہی نہ جان میں جان
آج ہوا ہے اک ناری کو سندرتا کا گیان

کندن سا پنڈا اور اس پر ابٹن کی مہکار
دیکھ رے مانجھی چھوٹ نہ جائے ہاتھوں سے پتوار

اندھیارے میں انگ انگ سے پھوٹ رہا تھا نور
پاگل منوا پوچھ اٹھا یہ بدن ہے یا بلّور

مسک گئی مری ریشمی چولی جان ہوئی ہلکان
ساجن تیری ہٹ کے آگے ٹوٹ گیا مرا مان

سوچ سوچ کے مر مر جاؤں اب میں لاج کے مارے
رات اکیلی کیوں آئی تھی ساجن تیرے دوارے

انجانے میں تو نے ساجن چھوا تھا میرا ہات
کانٹے بچھ گئے راہ میں میری سوئی نہ ساری رات

جیون ساگر میں اٹھا ہے جوبن کا طوفان
آری گوری امرت متھ لیں ہم بھی دیو سمان

آندھی میں بھی بالے رکھا اس کے پیار کا دیپ
لیکن وہ نرموہی نکلا بن موتی کا سیپ

پونم کے چندا پر بھاری اس کا روپ سروپ
اس کا تو وشواش نہ کیجو وہ بھادوں کی دھوپ

جیون بھر کا روگ دے گیا نرموہی چت چور
بولوں کا وہ بڑا ہی میٹھا من کا بڑا کٹھور

پریت کا کیا ہے پریت ہے گوری دھوپ چھاؤں کا کھیل
جیسے کوار کی رت البیلی جیسے ہرن کلیل

ناگفتنی

وہ بھولا بسرا شہر جسے لوگ آج بھی میرٹھ کہتے ہیں اور جو انقلاب کا پہلا نقیب اور جنگِ آزادی کی پہلی آواز تھا، اسی انقلاب پرور لیکن رومان انگیز شہر کی پرانی مسجدوں اور غیر آباد مندروں کی کائی سے ہریائی ہوئی فصیلوں کے سائے میں میرا بچپن نوجوانی کے گداز اور شر انگیز جذبوں سے مانوس ہوا۔ اسی شہر کی دھول میں اٹی ہوئی گلیوں میں مدتوں آنکھ مچولی، چور سپاہی اور ایسے ہی چھپ چھپ کر رومان لڑانے والے کھیل کھیل کر میرے احساس نے شربتی خوابوں کی تعبیر تلاش کی اسی شہر کے کھنڈروں میں میں نے چاند کو ابھرتے، چمکتے اور ڈوبتے دیکھا چمیلی کی ہری کنج باڑھ میں کھلے ہوئے لاتعداد سفید پھولوں کی بھینی بھینی خوشبوؤں کو اپنی روح کی گہرائیوں میں محسوس کیا اور اسی کے سنسان راستوں پر کسی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر گھومتے ہوئے شاعری کے جمال کو گلابی ہونٹوں اور سرخ سرخ رخساروں کی پاکیزگی سے نکھارا۔ اور جذبوں کی گدگداہٹ کچھ یوں محسوس کی جیسے کوئی مخروطی انگلیوں سے وجدان کے لویں ہولے ہولے سہلا رہا ہو اور میرے اندر احساس کا جوالا مکھی پھوٹ بہا۔ من مندر کے پتھریلے آنگن میں دیوداسیوں کا رقص، فکر کے صحراؤں میں سنسناتی ہوئی ہواؤں کے بگولے، وجدان کے باغیچے میں چمپا کے پھولوں کی سہاگن خوشبو رنگ برنگی تتلیوں کی بے آواز اڑان، سب نے مل کر گویا مجھے دیوانہ بنا دیا۔ اور اسی احساسِ جمال کے لمحے لمحے کو میں نے اپنے شعروں میں محفوظ کر لینا چاہا۔

میں کہتا! سنو، میں آوارہ ہواؤں کا پاگل پن ہوں مجھے دائروں میں مت سمیٹو، میں ان مانوس فضاؤں کا بولتا ہوا جادو ہوں جو میرٹھ کالج کے خوبصورت ماحول کو احاطہ کئے ہوئے تھیں، جہاں پشپا تھی۔ راجیشوری تھی، عذرا تھی اور میرے گلاب کے پھول تھے۔ میں کہتا کہ میں ان

رخساروں کا گلابی رنگ ہوں جو مجھے دیکھ کر دہک اٹھتے تھے، ان آنچلوں کا آوارہ پن ہوں جو میرے سامنے چپکے سے ڈھلک جاتے تھے۔ میں بائرن کا لاابالی پن ہوں۔ کیٹس کا کرب ہوں۔ شیلے کے احساس کا انوکھا پن ہوں۔ میں بولتا رہا سب سنتے رہے۔

پھر یوں ہوا کہ ۱۹۵۹ء میں وقت کی کیکئی نے مجھے بن باس دے دیا۔ میری سیتا گویا مجھ سے بچھڑ گئی۔ میں نے اس کی بارہ برس شکل نہیں دیکھی۔ میرے احساس کا آئینہ دھندلا گیا۔ میرے وجدان کے پر کٹ گئے۔ میری کتھا تلسی داس تو لکھنے لگا۔ لیکن میرا قلم زنگ آلود ہوگیا۔ دل میں جوالا مکھی ابلتا رہا لیکن پھوٹ کر بہہ نہ سکا۔ احساس الفاظ میں نہ ڈھل سکے میں گونگا ہوگیا۔ مجھے وقت نے بقول جون ایلیا کماؤ پوت بنا دیا... پھر یوں ہوا بن باس کے دن ختم ہوئے۔ سیتا گویا سے پھر عشق کی پینگیں بڑھنے لگیں۔ بن باس کا یہی کرب درد بن کر ہر شعر میں اترنے لگا۔ اور آج یہی کرب میری شاعری کا سرمایہ ہے۔

شاعری میں میرا commitment زندگی کے ساتھ ہے۔ اور یہ رشتہ ترقی و تعمیر کے جذبوں سے سرشار ہے۔ میری شاعری میری ذات کا وہ کرب ہے جو جمالیات سے لے کر ترقی پسند احساسات تک پھیلا ہوا ہے اور اپنی شاعری کا یہی پھیلاؤ مجھے عزیز ہے "موج موج تشنگی" میرے فکری سفر کا ایک حصہ ہے۔ یہ فکری سفر کبھی زلفوں کے چھاؤں میں آسودۂ منزل ہوا ہے اور کبھی زندگی کے سنگلاخ راستوں سے گذر کر ان حقائق تک پہنچا ہے جہاں زندگی کے چہرے پر درندگی کے ہاتھوں لگی ہوئی خراشوں سے خون رس کر ایک ایسی داستان کی سرخی بن گیا ہے جس میں نئی صبح کی نوید بھی ہے اور نئے انقلاب کا پیغام بھی۔

میری شاعری کے پھیلاؤ کو سمیٹنے میں میرے دوست محسن بھوپالی اور سحر انصاری کا فکر انگیز ہاتھ شامل ہے۔ انہوں نے میری فکر کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو سمیٹ کر "موج موج تشنگی" میں منقلب کر دیا۔

عالم تاب تشنہ